الفقه الاکبر

تالیف

امام ابوحنیفۃ نعمان بن ثابت

۸۰ھ — ۱۵۰ھ

علمی مرکز

الفقہ الاکبر

تالیف: امام ابوحنیفہؒ نعمان بن ثابت

مترجم وشارح: ڈاکٹر عبدالرحیم اشرف بلوچ

مقدمہ: ڈاکٹر محمد میاں صدیقی

نام کتاب : الفقہ الاکبر

مصنف : امام ابو حنیفہؒ نعمان بن ثابت

مترجم و شارح : ڈاکٹر عبدالرحیم اشرف بلوچ

مقدمہ : ڈاکٹر محمد میاں صدیقی

طبع اول : اکتوبر ۱۹۹۸ء

زیر اہتمام : محمد ابو بکر صدیقی

مطبع : مارشل پرنٹنگ پریس ۔ راولپنڈی

ناشر : علمی مرکز ۔ راولپنڈی

تعداد : ایک ہزار

قیمت : 120-00

تقسیم کار : ملت پبلی کیشنز ۔ فیصل مسجد اسلام آباد

پروگیسو بکس ۔ ۴۰ اردو بازار لاہور

فہرست عنوانات

حرفِ اول

کم و بیش تین برس قبل ادارۂ تحقیقاتِ اسلامی اسلام آباد کے زیر اہتمام اسلام آباد میں ، "امام اعظم ابو حنیفہ نعمان بن ثابت رحمہ اللہ ۔ شخصیت اور علمی آثار" کے عنوان سے ایک بین الاقوامی کانفرنس کے انعقاد کا فیصلہ ہوا ، اسی وقت میرے دل میں یہ داعیہ پیدا ہوا کہ امام صاحب کے حوالہ سے کوئی علمی تحریر اس موقعہ پر شائع کی جائے ۔ اسی دوران کراچی جانا ہوا ، وہاں حسبِ دستور و معمول محترم مولانا مفتی محمد زر ولی خاں صاحب کی خدمت میں حاضر ہوا ، مجوزہ کانفرنس کا بھی ذکر ہوا ۔ انہوں نے بجائے اس کے کہ کسی اہل علم کی کوئی کتاب یا تحریر امام صاحب کے بارے میں شائع کی جائے ، اپنی اس خواہش کا اظہار کیا کہ امام ابو حنیفہؒ کی اپنی تحریر "الفقہ الاکبر" طبع کی جائے ۔ اصل تحریر بھی کم یاب ہے ،اور اس پر ترجمہ و تشریحات کی نوعیت کا کوئی بھی کام اردو زبان میں نہیں ہوا ۔

دوسرے یہ کہ بعض اہل علم نے اس بات پر شک و شبہ کا اظہار کیا ہے کہ کیا واقعی "الفقہ الاکبر" امام ابو حنیفہ کی تالیف ہے ۔

مفتی صاحب نے یہ بھی فرمایا کہ : میں اپنے مدرسہ (مدرسہ عربیہ احسن العلوم) میں اسے درسی کتب کے طور پر پڑھاتا ہوں ۔

کراچی سے واپس آیا اور اپنے عزیز ساتھی اور مفتی صاحب کے استاد بھائی ڈاکٹر عبد الرحیم اشرف بلوچ سے درخواست کی کہ وہ الفقہ الاکبر کا اردو ترجمہ اور شرح لکھ دیں ۔ انہوں نے میری درخواست کو

شرفِ قبولیت بخشا ، اپنی تمام تر دفتری اور علمی مصروفیات کے باوجود "الفقہ الاکبر" کا خوب صورت اردو ترجمہ اور شرح لکھ کر میرے حوالہ کی ۔ جو اب کتاب کے خوب صورت اور دیدہ زیب پیرہن میں آپ کے ہاتھوں میں ہے ۔ناچیز راقم نے ایک بسیط مقدمہ لکھا ہے جس میں امام صاحب کے اس مختصر رسالہ کا تعارف بھی ہے، اور اس اشکال کا جواب بھی کہ یہ امام ابوحنیفہ کی تالیف ہے یا نہیں ؟۔

میں محترم مفتی محمد زر ولی خان صاحب کا شکر گزار ہوں کہ انہوں نے ایک انتہائی دقیع علمی مشورہ دیا اور "الدال علیٰ الخیر کفاعلہ" کا مصداق بنے ۔ اور برادر مکرم ڈاکٹر عبد الرحیم اشرف بلوچ کا بھی کہ انہوں نے محنت اور لگن سے نہ صرف اس اہم رسالہ کا اردو ترجمہ کیا بلکہ ایسی شرح لکھی جو نہ اتنی مجمل کہ قاری متن سمجھنے سے قاصر رہے اور نہ اتنی مفصل کہ پڑھنے میں دشواری محسوس ہو ۔

اللہ تعالیٰ ہم سب کی مساعی کو قبول فرمائے ۔ آمین

محمد میاں صدیقی

۶ جمادی الآخر ۱۴۲۱ھ

اسلام آباد

بسم اللہ الرحمن الرحیم

مقدمہ

نعمان نام، ابو حنیفہ کنیت ، امام اعظم لقب ، ابن خلکان کے مطابق شجرہ نسب یہ ہے :ابو حنیفہ النعمان بن ثابت بن زوطی بن ماہ ۔ مورخ بغدادی نے امام کے پوتے اسماعیل کی زبانی یہ روایت نقل کی ہے : "میں اسماعیل بن حماد بن نعمان بن ثابت بن نعمان بن مرزبان ہوں "۔ اسماعیل بھی یہ کہتے ہیں کہ ہم فارسی النسل ہیں، اور کبھی کسی کی غلامی میں نہیں رہے۔ ناموں کی ترکیب سے بھی یہی ظاہر ہوتا ہے کہ آپ فارسی النسل ہیں ۔

اسماعیل نے امام صاحب کے دادا کا نام نعمان ، اور پردادا کا نام مرزبان بتایا ، حالانکہ عام طور پر زوطی ، اور ماہ مشہور ہیں ۔ غالباً جب زوطی ایمان لائے ہوں گے تو ان کا اسلامی نام نعمان رکھ دیا گیا ہو گا ، اسماعیل نے سلسلہ نسب بیان کرتے وقت وہی اسلامی نام لیا[۱]۔

یہ بھی ممکن ہے کہ زوطی کے والد کا حقیقی نام کچھ اور ہو گا ، ماہ اور مرزبان لقب ہوں گے کیوں کہ اسماعیل کی روایت سے یہ بھی ثابت ہے کہ ان کا خاندان فارس کا ایک معزز اور مشہور خاندان تھا۔ فارس میں سردار اور رئیس شہر کو مرزبان کہتے ہیں ، اس لیے قرین قیاس یہی ہے کہ ماہ اور مرزبان لقب ہیں نہ کہ نام۔

زوطی کی نسبت وثوق سے نہیں کہا جا سکتا کہ خاص کس شہر کے رہنے والے تھے ، مورخوں نے مختلف شہروں کے نام لیے ہیں لیکن قرائن اور دلائل کے

بغیر کسی ایک کو ترجیح دینا مشکل ہے۔ البتہ یقینی طور پر یہ بات ثابت ہے کہ ان کا تعلق سرزمین فارس سے تھا ، اور وہ فارسی النسل تھے ۔

اس وقت ان علاقوں میں بہت سے خاندان اور قبیلے اسلام کی دولت سے بہرہ ور ہو چکے تھے ، غالباً زوطی اسی زمانے میں اسلام لائے اور جوش شوق میں عرب کا رخ کیا۔ حضرت علی کرم اللہ وجہہ کا دور خلافت تھا اور شہر کوفہ کو دارالخلافہ ہونے کا شرف حاصل تھا ، اسی شرف و خصوص نے زوطی کو کوفہ میں طرح اقامت ڈالنے پر مجبور کیا[۲]۔

حضرت علیؓ کے دربار میں حاضری

تمام ثقہ مورخین کہتے ہیں کہ امام صاحب کے والد صغر سنی میں حضرت علیؓ کی خدمت میں حاضر ہوئے ، حضرت امیر المؤمنین نے ان کے اور ان کی اولاد کے حق میں دعائے خیر کی ، امام صاحب کے دادا زوطی کبھی کبھی حضرت امیر کے دربار میں حاضر ہوتے اور خلوص عقیدت کے آداب جا لاتے ۔ ایک بار نوروز کے دن ، کہ پارسیوں کا یوم عید ہے ۔ فالودہ لے کر حاضر ہوئے اور حضرت امیر کی خدمت میں پیش کیا ، حضرت نے فرمایا : "نوروزنا کل یوم"۔ ہمارے ہاں تو ہر روز نوروز ہے ۔ اس واقعہ سے ثابت ہوتا ہے کہ امام کا خاندان اتنا باحیثیت اور دولت مند تھا کہ خلیفۂ وقت کی خدمت میں شاہی حلوہ ، بطور ہدیہ پیش کرتا تھا جو اس زمانے میں اہل ثروت ہی کے دستر خوانوں پر چنا جاتا تھا[۳]۔

امام صاحب اسم با مسمّٰی

ابن حجر مکی ہیثمی کہتے ہیں کہ : امام صاحب اسم با مسمّٰی ہیں ۔ کیونکہ نعمان دراصل اس خون کو کہتے ہیں جس پر بدن کا سارا ڈھانچہ قائم ہے ، اور جس کے ذریعے جسم کی ساری مشینری حرکت کرتی ہے ، اسی لیے روح کو بھی نعمان کہتے ہیں ، امام صاحب کی ذاتِ گرامی ، اسلام میں قانون سازی کی خشتِ اول ، اور اس کے مدارج و مشکلات کا مرکز ہے ، اس بنا پر آپ کا نام نعمان بہت موزوں بھی ہے اور اسم با مسمّٰی کا مصداق بھی ، چنانچہ کہتے ہیں : ”ابوحنیفہ فقہ اسلامی کا بنیادی ستون ہیں“۔

سرخ اور خوشبودار گھاس کو بھی نعمان کہتے ہیں ۔ امام صاحب کے محاسن ، اور علم و فضل کی مہک سے اسلامی دنیا کا گوشہ گوشہ معطر ہے ۔

ابن حجر ہیثمی ہی لکھتے ہیں کہ : فعلان کے وزن پر نعمت سے بنا ہے ، نام میں معنوی رعایت یہ ہے کہ آپ کی ذاتِ گرامی ، مخلوق خدا کے لیے نعمت عظمیٰ ہے ، کہتے ہیں : ”فابو حنیفة نعمة اللہ علیٰ خلقه“۔ یعنی ابو حنیفہ اللہ کی مخلوق کے لیے ایک نعمت ہے [۴]۔

ابو حنیفہ کنیت رکھنے کی وجہ

تذکرہ نگاروں نے ابو حنیفہ کنیت رکھنے کی مختلف وجوہ بیان کی ہیں ۔ کسی نے کہا : حنیفہ عراقی زبان میں دوات کو کہتے ہیں ، آپ کو قلم اور دوات سے کیونکہ لگاؤ تھا اس لیے ابو حنیفہ کنیت اختیار کی گئی ، لیکن یہ محض قیاس اور انکل کے تیر ہیں ، حقیقت سے اس کا کوئی واسطہ نہیں ۔ ان توجیہات کی راہ اس لیے کھلی کہ

آپ کے کوئی بیٹی نہ تھی ، صاحب خیرات الحسان نے تصریح کی ہے کہ :

ولایعلم له ذکر ولاانثیٰ غیر حمادٍ.

(آپ کے کوئی بیٹی نہ تھی ، اور حماد کے سوا نہ کوئی بیٹا تھا)۔

حنیفہ ، حنیف کا مؤنث ہے۔ حنیف وہ شخص کہلاتا ہے جو سب سے کٹ کر صرف مولیٰ کا ہو رہے ۔

اشخاص میں جیسے حضرت ابراہیم خلیل اللہ حنیف ہیں ایسے ہی ادیان میں ان کا دین ، دین حنیف اور ملتوں میں ان کی ملت ، ملتِ حنیفہ ہے ۔ امام صاحب میں دینِ حنیف اور ملت حنیفہ کی خدمت کا جذبہ ابتدا ہی سے تھا ، اس لیے زیادہ قرین قیاس یہی ہے کہ آپ نے اس لطیف احساس کے اظہار کی خاطر ، تفاؤل کی بنا پر اپنی کنیت ابو حنیفہ اختیار فرمائی ۔ جیسے لوگ عموماً ابو الحسنات ، ابوالمکارم اور ابوالکلام وغیرہ کنیتیں رکھ لیتے ہیں ، بجا طور پر کہا جا سکتا ہے کہ آپ کی یہ کنیت حقیقی نہیں ، وصفی معنی کے اعتبار سے ہے ۔ یعنی ابوالملة الحنیفہ ۔

ابو حنیفہ تابعی ہیں

امت محمدیہ میں سب سے بزرگ اور اعلیٰ مرتبہ صحابہ کا ہے ، جنہیں بارگاہ خداوندی سے دائمی خوشنودی کا پروانہ مل چکا ہے :

> ”اور جو لوگ قدیم ہیں ، سب سے پہلے ہجرت کرنے والے ، اور مدد کرنے والے ، اور وہ لوگ جنھوں نے ان کی خوبی کے ساتھ پیروی کی ، اللہ ان سے راضی ہوا اور وہ اللہ سے راضی ہوئے ۔“

اور کاشانہ نبوت سے جن کے بارے میں اعلان ہو چکا ہے :

اصحابی کالنجوم بایهم اقتدیتم اهتدیتم ۔

(میرے ساتھی میرے ستاروں کی طرح ہیں ، جس کی بھی پیروی کرو گے ، سیدھی راہ پا جاؤ گے)۔

صحابہ کے بعد تابعین ، اسلام میں ایک امتیازی مقام رکھتے ہیں ۔ فرمانِ نبویؐ ہے :

خیر الناس قرنی ، ثم الذین یلونهم ، ثم الذین یلونهم

(بہترین لوگ میرے زمانے کے لوگ ہیں ، اس کے بعد جو ان سے متصل ہیں اور پھر جو ان سے متصل ہیں)۔

امام محی الدین نووی اس حدیث میں لکھتے ہیں کہ "حضور کا دور ، صحابہ کا زمانہ ہے دوسرا دور تابعین کا ، اور تیسرا تبع تابعین کا" (۵)۔

امام صاحب ، ۸۰ ہجری / ۶۹۹ء، میں پیدا ہوئے ۔ اس وقت تمیں صحابہ بقید حیات تھے ۔ اس حقیقت کا اعتراف سبھی نے کیا ہے کہ ابوحنیفہ نے صحابہ کا زمانہ پایا ہے ، حافظ ذہبی ، حافظ عسقلانی ، ابن جوزی ، خطیب بغدادی ، ابن خلکان اور ابن حجر مکی جیسے جہابذۂ فن نے تسلیم کیا ہے کہ ابوحنیفہ ،جناب رسالت مآب کے خادم خاص حضرت انس بن مالک کی زیارت سے کئی بار مشرف ہوئے ہیں۔

حضرت انس کی آمدورفت کے علاوہ خود کوفہ میں امام صاحب کی پیدائش کے وقت نو صحابہ موجود تھے ۔ ابن ندیم ، اور ابن سعد نے آپ کو تابعین کے طبقہ پنجم میں شمار کیا ہے ۔ اختلاف اگر ہے تو صرف اس بات میں کہ امام صاحب نے کسی صحابی سے روایت کی یا نہیں ۔

یہ ایک طویل اور فنی بحث ہے ۔ اگر یہ مان بھی لیا جائے کہ امام صاحب نے کسی صحابی سے روایت نہیں کی ، تاہم یہ شرف ان کی قسمت میں ضرور تھا کہ جن آنکھوں نے پیغمبر علیہ السلام کا جمال جہاں تاب دیکھا تھا ، ان کے دیدار سے

عقیدت کی آنکھیں روشن کیں ۔

یہ واقعہ اگرچہ ایک تاریخی واقعہ ہے ، مگر کیونکہ اس سے تابعیت کا رتبہ حاصل ہوتا ہے ،اس نے مذہبی صورت حال اختیار کر لی ، اور بڑی بحثیں قائم ہو گئیں۔

بلا شبہ ابو حنیفہ کو اس شرف پر ناز تھا ، اور بجا ناز تھا کہ انہوں نے ان مقدس اور پاکیزہ ہستیوں کے دیدار سے آنکھیں ٹھنڈی کی تھیں جنہیں پیغمبر خدا علیہ السلام کا دیدار اور شرف صحبت حاصل ہوا تھا ۔ تمام تذکرہ نگار یہ ماننے کے لیے مجبور ہیں کہ چاروں ائمہ مجتہدین میں ، بجز ابوحنیفہ کے یہ سعادت کسی کا نصیب نہ بن سکی ۔

غیر قومیں ممکن ہے ان باتوں کو معمولی خیال کریں لیکن ان واقعات سے اس والہانہ محبت ، بے پایاں عشق ، اور جوش عقیدت کا اظہار ہوتا ہے جو مسلمانوں کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور ان کے تعلق کے باعث صحابہ سے ہے ۔

فی الجملہ نسبتے بتو کافی بود مرا
بلبل ہمیں کہ قافیۂ گل بود بس ست

ذاتی محاسن

امام صاحب کو خدا نے حسن سیرت کے ساتھ ساتھ حسنِ صورت سے بھی نوازا تھا ۔ میانہ قد، خوش رو اور موزوں اندام تھے ۔ گفتگو بڑے صاف اور شیریں انداز سے کرتے ، کبھی تلخ لہجہ میں بات نہیں کرتے تھے ۔ انداز بیان اتنا سلجھا ہوا تھا کہ کیسا ہی مشکل مسئلہ ہو اس فصاحت اور خوبی سے بیان کرتے تھے کہ ہر سطح کا آدمی سمجھ جاتا۔

رہن سہن امیرانہ تھا اور کیوں نہ ہوتا۔ وسیع کاروبار کے مالک تھے، خاص قسم کا ریشمی کپڑا پہنتے جسے اس زمانے میں خز کہتے تھے، بناتے اور فروخت کرتے تھے، مختلف شہروں میں کاروباری نمائندے مقرر تھے، ہزاروں روپیہ یومیہ کا کاروبار ہوتا تھا۔ دار عمرو بن حریث میں جو جامع مسجد کوفہ کے قریب تھا امام صاحب کی دوکان اور کارخانہ تھا۔

آپ کے محاسن اخلاق کی اگر صحیح تصویر دیکھنی ہو تو ابو یوسف کی اس تقریر کے چند اقتباسات کافی ہیں جو انہوں نے آپ کے بارے میں ہارون رشید کے سامنے کی، ایک بار ہارون نے ابو یوسف سے کہا کہ ابو حنیفہ کے اوصاف بیان کیجیے! ابو یوسف نے کہا:

"میرے علم کے مطابق ابوحنیفہ نہایت پرہیزگار تھے، منہیات سے بچتے تھے، اکثر خاموش رہتے، بولتے کم اور سوچتے زیادہ تھے، کوئی شخص مسئلہ پوچھتا تو جواب دے دیتے، اگر اس مسئلہ کی تحقیق نہ ہوتی تو خاموش رہتے، بے حد سخی اور دریا دل تھے، کسی کے آگے ضرورت نہیں لے جاتے، اہل دنیا سے احتراز کرتے، دنیاوی جاہ و عزت کو حقیر سمجھتے، کبھی کسی کی غیبت نہ کرتے، جب کسی کا ذکر کرتے بھلائی کے ساتھ کرتے، بہت بڑے عالم تھے، مال و دولت کی طرح علم دوسروں تک پہنچانے میں بھی فیاض اور فراخ دل تھے"۔

ابو یوسف کا یہ تبصرہ سن کر ہارون الرشید نے کہا: "صالحین کے یہی اخلاق وصفات ہوتے ہیں" (۶)۔

درس و افتاء

امام صاحب نے اگرچہ اپنے استاد، حماد کی زندگی ہی میں اجتہاد کا درجہ حاصل کر لیا تھا، مگر شاگردانہ خلوص نے یہ گوارا نہ کیا کہ استاد کی موجودگی میں اپنا الگ دربار سجائیں، اس دور میں استاد کے ساتھ ادب و احترام کا جو حال تھا، وہ خود امام کی زبانی سنیے: "جب تک حماد زندہ رہے، میں ان کے گھر کی طرف پاؤں پھیلا کر نہیں سویا"۔ حماد نے ۱۲۰ ہجری میں رحلت کی، ان کی وفات نے کوفہ کے بے چراغ کر دیا۔ حماد نے ایک لائق بیٹا چھوڑا تھا جو باپ کی خالی مسند کو رونق بخش سکتا تھا، مگر سب کی نگاہ انتخاب ابو حنیفہ پر تھی، آخر کار انہی کو حماد کی مسند سونپی گئی۔ اسی اثناء میں امام نے خواب کو دیکھا کہ: پیغمبر خدا کی قبر مبارک کھود رہے ہیں، بیدار ہوئے تو بہت ڈرے، مختلف علماء سے تعبیر مانگی، سب نے یہی کہا کہ اس سے مراد یہ ہے کہ نبی علیہ السلام کے دین کی خدمت کرو گے۔

چند روز میں مجلس درس کی وہ شہرت ہوئی کہ کوفہ کی بہت سی چھوٹی چھوٹی درسگاہیں اور مجالس ٹوٹ کر امام کے حلقۂ درس میں آملیں، اور نوبت یہاں تک پہنچی کہ خود ان کے اساتذہ، مثلاً مسعر بن کدام، اور اعمش ان سے استفادہ کرنے لگے۔ اسپین کے سوا، اسلامی دنیا کا کوئی حصہ ایسا نہ رہا، جو ان کی شاگردی کے تعلق سے آزاد رہا ہو، یہ بات حقیقت بن گئی کہ امام کی استادی کے حدود خلیفۂ وقت کے حدود سے تجاوز کر گئے تھے۔

بلا شبہ، حماد کی وفات کے بعد وہ کوفہ میں فقہ اسلام پر سب سے ممتاز سند اور کوفی مکتب فقہ کے بڑے نمائندہ ہو گئے (۷)۔

آلِ رسول ﷺ سے عشق اور استفادہ

تاریخ اور تذکرہ کے ذخیروں سے یہ بھی ثابت ہوتا ہے کہ ابو حنیفہ نے جہاں اپنے دور کے جلیل القدر محدثین ، اور حماد جیسے فقہاء کے آگے زانوئے ادب تہہ کیا ، وہاں عراق میں ان فقہاء سے بھی استفادہ کیا جن میں بعض کا تعلق فرقہ کیسانیہ سے تھا بعض کا فرقہ زیدیہ سے ، اور بعض کا فرقہ امامیہ سے ، ان شیوخ کے فضل و کمال سے امام نے کیا اثر قبول کیا؟ اس بارے میں یہی کہا جا سکتا ہے کہ محبت آلِ نبیؐ کے سوا اس کا تاثر امام کی ذات کے کسی پہلو سے ظاہر نہیں ہوا۔

درحقیقت ابو حنیفہ کی تحصیل علم کی مثال اس شخص کی سی ہے جو مختلف عناصر سے غذا حاصل کرتا ہے اور ان سے ان کا قوام حیات تیار ہوتا ہے پھر ان عناصر کا اثر اس کے جسم پر نمایاں ہوتا ہے ، اسی طرح ابوحنیفہ ، ان مختلف عناصر سے روحانی غذا حاصل کرتے رہے ، یہاں تک کہ فکر جدید ، اور رائے قدیم کی دولت سے مالامال ہو کر پردۂ نمود پر ابھرے ۔ایسی غذا اگرچہ ان تمام عناصر سے مختلف ہو گی ، مگر ان سب کی خوبیاں اس میں بدرجہ اتم موجود ہوں گی ۔

ابو حنیفہ متواتر دو سال تک زید بن علی زین العابدین سے اخذ علوم کرتے رہے ۔ ان کے بارے میں خود ابو حنیفہ کہا کرتے : میں نے زید بن علی اور ان کے دوسرے افراد خاندان کو دیکھا مگر ان سے زیادہ فقیہ ، فصیح ، اور حاضر جواب کسی کو نہیں پایا۔

ایسے ہی تذکرہ نگاروں نے ابو حنیفہ کے امام جعفر الصادق کے ساتھ علمی رابطہ اور امام باقر کے ساتھ علمی مکالمہ اور اکتساب علم کا ذکر کیا ہے ۔

ابوحنیفہ نے امام جعفر الصادق سے بہت سی مشکلات قرآن حل کیں ،

حدیث کی سماعت بھی کی اور روایت بھی ، حافظ ذہبی ، تذکرۃ الحفاظ میں کہتے ہیں کہ ابو حنیفہ کہا کرتے تھے کہ اگر میرے دو سال امام جعفر الصادق کی خدمت میں نہ گزرے ہوتے تو میں ہلاک ہو گیا ہوتا (۸) ۔

تصانیف

ابن ندیم نے الفہرست میں آپ کی چار کتابوں کا نام لکھا ہے ۔ الفقہ الاکبر، العالم والمتعلم ، الرد علی القدریہ ، عثمان البتی کے نام خط۔ ابن ندیم کہتے ہیں کہ امام کی واحد مستند تحریر جو ہم تک پہنچی وہ ، وہ خط ہے جو انہوں عثمان البتی کے نام لکھا تھا ، اور جس میں انہوں نے بڑے نفیس طریقہ سے اپنے نظریات کی مدافعت کی ہے ۔ یہ خط العالم والمتعلم، اور الفقہ الابسط کے ساتھ قاہرہ (۱۳۶۸ھ / ۱۹۴۹ء) میں طبع ہو چکا ہے ۔

الفقہ الاکبر کی مختلف شروح لکھی گئیں ، جن میں ملا علی قاری (م۔ ۱۰۰۱ھ) کی شرح زیادہ مقبول اور متداول ہے ۔

ان کے علاوہ ذیل کی کتب بھی ابو حنیفہ سے منسوب کی جاتی ہیں : (۹)

القصیدۃ النعمانیہ، آں حضرت کی مدح میں قصیدہ — مطبوعہ : استنبول ۱۲۶۸ھ

المطلوب ، اسی قصیدہ کی شرح — مطبوعہ : مصر ۱۲۹۳ھ

المقصود ، علم صرف میں رسالہ — مطبوعہ : استنبول ۱۲۹۳ھ

تحملۃ المقصود — مطبوعہ : استنبول ۱۲۲۴ھ

وفات

آپ کی وفات میں بھی حق گوئی و بے باکی کی ایک زندۂ جاوید داستان ہے، حق گوئی ہر دور میں جرم رہی ہے ، اسی جرم کی پاداش میں منصور نے ۱۴۶ھ میں آپ کو قید کیا مگر بند وسلاسل نے ان کی شہرت اور اثر و نفوذ میں اور اضافہ کر دیا ، قید خانہ میں بھی تعلیم و تدریس ، اور ابلاغ حق کا سلسلہ جاری رہا:

ہے مشق سخن جاری، چکی کی مشقت بھی !
کیا طرفہ تماشا ہے ، حسرت کی طبیعت بھی

امام محمد نے ، جو فقہ حنفی کے اہم رکن ہیں ، قید خانہ ہی میں ابو حنیفہ سے تعلیم حاصل کی ۔

عباسی حکومت ، امام کے علمی اور سیاسی اثر و نفوذ ، اور ان خیالات سے خائف تھی جو وہ اہل بیت ، نفس زکیہ ، اور ابراہیم کے متعلق رکھتے تھے ، اور امام کو قاضی القضاۃ بنانے کی تمام تر کوششیں اسی بنا پر تھیں کہ آپ کی شخصیت ، علمی اور سیاسی بساط سے سمٹ کر خلافت و حکومت کے ایوانوں میں محدود ہو جائے ۔ لیکن ظاہر ہے کہ ابو حنیفہ جیسی عبقری شخصیت قصر خلافت تک کیسے محدود ہو سکتی تھی ، قاضی القضاۃ بنانے کے جب تمام حربے بے کار ہو گئے تو آپ کو کھانے میں زہر دلوا دیا گیا ، زہر کا اثر محسوس کیا تو حضور حق سجدہ میں گر گئے ، اور اسی حالت میں روح قفس عنصری سے پرواز کر گئی ۔

آپ کی وفات کی خبر سارے شہر میں پھیل گئی ، دور دراز سے لوگ ہزاروں کی تعداد میں جمع ہو گئے ۔ قاضی شہر ، حسن بن عمارہ نے غسل دیا ، نہلاتے تھے اور کہتے جاتے تھے

"خدا کی قسم تم سب سے بڑے فقیہ ، بڑے عابد اور بڑے زیرک تھے ، تم تمام خوبیوں کے جامع تھے ، تم نے اپنے جانشینوں کو مایوس کر دیا کہ وہ تمہارے مرتبہ کو پہنچیں"۔

غسل سے فارغ ہوئے تو لوگوں کا اتنا ہجوم تھا کہ چھ بار نماز جنازہ پڑھی گئی ، پہلی بار نماز جنازہ میں پچاس ہزار آدمیوں نے شرکت کی ۔

سن وفات ، ۱۵۰ھ / ۷۶۷م

ابو حنیفہ اور علم کلام

امام ابوحنیفہ کے تمام تذکرہ نگار اس بات پر متفق ہیں کہ انہوں نے تحصیل علم یا یوں کہیے کہ اپنی علمی زندگی کا آغاز علم کلام سے کیا۔

وہ ۸۰ ہجری میں کوفہ میں پیدا ہوئے ، وہ دور خاصا پر آشوب دور تھا ، خصوصاً عراق۔ حجاج بن یوسف وہاں کا گورنر تھا ، اس کے ظلم و ستم کی بدولت ایک قیامت بپا تھی ، اس کے ظلم و ستم کے نشانے حق گو اہل علم و فضل تھے ۔ وہی حق گوئی اور حق پرستی کی پاداش میں دور ورسن کو چوم رہے تھے ۔ اس پر آشوب دور میں بھی تعلیم و تعلم کا سلسلہ بند نہیں ہوا تھا ۔ جگہ جگہ حدیث و روایت کی درسگاہیں قائم تھیں، فقہاء اور محدثین ، خطرات اور بے یقینی کے باوجود درس و تدریس میں مشغول تھے ۔

۹۵ ہجری میں حجاج کا انتقال ہو گیا، اور ظلم و جبر کی وہ تلوار ٹوٹ گئی جو ہر وقت اہل حق کے سروں پر لٹکی رہتی تھی ۔ ۹۶ھ میں سلیمان بن عبد الملک نے بنو امیہ کی مسند خلافت کو زینت بخشی ۔ مورخین کا کہنا ہے کہ بنو امیہ میں عمر بن عبد العزیز کے بعد سب سے بہتر خلیفہ اور حکمران تھا ۔ اس کے انتقال کے بعد ۹۹

ہجری میں عمر بن عبد العزیز مسند آرائے خلافت ہوئے۔ انہوں نے پوری حکومت کا رنگ ہی بدل دیا، ملک میں عدل و انصاف ، علم و عمل اور خیر و برکت کی روح تازہ ڈال دی۔ دینی علوم کی ایسی حوصلہ افزائی کی کہ گھر گھر علم کے چرچے پھیل گئے۔ امام زہری کو حکم دیا کہ احادیث کو جمع کر کے ان کے مجموعے تیار کرائیں اور ملک کے تمام علاقوں تک انہیں پہنچائیں ، تاکہ ہر شخص تک سنت رسول پہنچ جائے کیوں کہ قرآن نے ہمیں اسی کی پیروی کا حکم دیا ہے۔

بہر کیف حجاج کے عہد گورنری میں امام ابوحنیفہ تحصیل علم کی طرف راغب نہ ہو سکے۔ ملکی اور قومی حالات سازگار نہ ہونے کے علاوہ امام صاحب کو اپنے گھرانے کا ماحول علمی بہت کم ، تاجرانہ زیادہ تھا۔ باپ دادا ، کپڑے کے تاجر اور صنعت کار تھے۔ امام کو وہ ورثے میں ملی تھی۔ امام صاحب نے اپنی غیر معمولی ذہانت اور نکتہ رسی سے اسے اور وسعت دی۔ علمی تحریکوں میں قوت پیدا ہوئی ، علمی ماحول نے امام صاحب کو بھی ان کے وسیع تر کاروبار کے باوجود متاثر کیا۔ کوفہ کے مشہور امام اور محدث شعبی کی ترغیب اور حوصلہ افزائی امام کو علمی مجلسوں میں لے آئی۔ اس وقت علم جس چیز کا نام تھا وہ ادب ، انساب ، ایام العرب ، حدیث ، فقہ ، اور کلام تھا۔ لیکن کلام کی وہ نوعیت نہ تھی جو بعد میں اس نے اختیار کی۔ اس وقت تک اسلامی عقائد و مسائل پر فلسفے کا سایہ نہیں پڑا تھا۔ اسلام جب تک عرب کے حدود میں رہا ، اس کے مسائل صاف اور سادہ رہے۔ جب عرب سے نکل کر روم ، فارس ، افریقہ اور وسطی ایشیا تک پہنچا تو مسائل میں رنگ آمیزیاں شروع ہو گئیں۔ علاقے کی وسعت ، تمدن کی رنگا رنگی ، اور مختلف قوموں اور نسلوں کی اسلام میں شمولیت نے اہل علم کے سامنے یہ ضرورت پیدا کر دی کہ وہ دین کے عقائد اور اعمال کو عقلی دلائل کے ساتھ بھی پیش کریں۔ اس ضرورت کے پیدا کرنے والے سادہ لوح مسلمان تو بہت کم تھے ، زیادہ لوگ وہ تھے ، بلکہ در

حقیقت وہی تھے جو اسلام کے بارے میں شک اور تذبذب کی دلدل میں پھنسے ہوئے تھے۔ اور پھر ان میں بھی ایک مؤثر گروہ وہ تھا جن کی نیت یہ نہ تھی کہ دلائل کے بعد حق کو قبول کر لیں گے۔ ان کی نیتوں میں فساد تھا ، اور وہ یہ چاہتے تھے کہ مسلم علماء سے دلائل کا مطالبہ کر کے دین حق کو عوام کی نظروں میں خفیف اور ہلکا کر دیں تاکہ وہ اس کو بے دلیل تسلیم نہ کریں۔

قرآن حکیم میں اللہ کی ذات و صفات ، مبداء اور معاد ، نبوت و رسالت ، اور جنت و جہنم کے متعلق جو کچھ تھا ، اہل عرب نے اس کو اجمال کے ساتھ پڑھا اور بے غبار نظر سے دیکھا ، اعتقاد کے لیے وہی کافی تھا۔ لیکن عجمی تمدن نے بحث و تحقیق کا دروازہ کھولا ، اور لوگوں کو دلائل کی راہ دکھائی۔ اللہ کی صفات کی عینیت و غیریت ، تنزیہ و تشبیہ ، حدوث و قدم۔ اس طرح کی بہت سی بحثیں پیدا ہو گئیں۔ اعتقادی اور تعبدی مسائل میں بھی عقلی دلائل کا مطالبہ کیا جانے لگا۔ قدریہ ، جبریہ ، مرجئہ ، معتزلہ ، جہمیہ ، خوارج۔ بہت سے باطل و منحرف فرقے وجود میں آگئے۔ ان فتنوں نے اتنا سر اٹھایا کہ اہل حق جو اب تک ان بحثوں سے الگ تھے ان کو بھی ان فتنوں کی مدافعت بلکہ سرکوبی کی طرف متوجہ ہونا پڑا۔ ان حالات نے کلام کو ایک مستقل علم اور فن کے قالب میں ڈھالا۔

ان بحثوں کی ابتداء اگرچہ ان لوگوں نے کی جو عجم کی خاک سے اٹھے تھے ، یا ان کے فکر و ذہن کو عجمی تہذیب و تمدن نے مغلوب کر لیا تھا مگر اہل عرب میں اس صورت حال سے برہمی پیدا ہوئی ، اور یہ قدرتی امر تھا۔ کیوں کہ وہ اس طرح کی بحثوں اور مناظروں سے نامانوس تھے۔ وہ لفظی موشگافیوں میں نہیں پڑتے تھے ، انہیں فنی اور عقلی باریک بینیوں سے کوئی سروکار نہیں تھا۔ وہ تو عبادت کے بارے میں یہ تک نہیں پوچھتے تھے کہ اس کا کون سا جزو فرض ہے ، اور کون سا سنت ، شرط یا رکن کا درجہ کسے حاصل ہے ؟ علم کلام زمانہ مابعد میں مرتب

و مدون ہو کر اکتسابی علوم میں داخل ہو گیا لیکن امام ابوحنیفہ کے دور میں اس کی تحصیل کے لیے قدرتی ذہانت ، نکتہ رسی ، ہر وقت مخاطب کو جواب دہی کی قدرت اور اس کے ساتھ ٹھوس دینی معلومات درکار تھیں ۔ قدرت نے امام ابو حنیفہ کو ان تمام باتوں سے نوازا تھا ۔ امام کی ذہانت ، طباعی ، نکتہ رسی اور کوفہ کی علمی فضا نے انہیں اس فن میں اس درجہ کمال تک پہنچا دیا کہ باطل فرقوں کے وہ رجالِ کار جنہیں اپنی علمیت اور نکتہ آفرینی پر گھمنڈ تھا ، وہ امام کے ساتھ بحث و مناظرے سے جی چرانے لگے تھے ، بہتوں سے بحث و مناظرے ہوئے وہ خالص عقلی انداز میں کیے اور ہمیشہ غالب رہے ۔ لیکن ایک عرصے کے بعد اس دنگل سے باہر نکل آئے اور اپنے آپ کو فقہ کے حوالے کر دیا ، اور اسلامی قوانین کی ترتیب و تدوین ، اور اجتہاد کے اصول و قواعد کی درجہ بندی کا وہ کارنامہ سرانجام دیا کہ بعد میں آنے والا کوئی بھی اس میں اضافہ نہیں کر سکا ۔ اس حوالہ سے یہاں گفتگو کرنا مقصود نہیں ہے ۔ یہاں صرف یہ بتانا ہے کہ امام ابو حنیفہ کی عملی زندگی کی ابتداء کلام سے ہوئی ، انہوں نے فقہ کو بعد میں مرتب و مدون کیا ، اس سے پہلے عقائد کے اثبات میں ایسے مضبوط دلائل پیش کیے جنہیں کوئی توڑنے پر قادر نہ ہوا ۔

یہی وجہ ہے کہ اس دور میں جو کلامی مسائل تھے ان کے بارے میں امام صاحب کی آراء کتابوں میں نقل کی گئیں ۔ حقیقت ایمان ، گناہ کبیرہ کے مرتکب کا حکم ، قضاء و قدر اور جبر و اختیار ۔ ایسے اہم اور بنیادی مسائل سے امام صاحب نے بحث کی ہے ۔ ان کی یہ آراء دو ذریعوں اور طریقوں سے بعد کے لوگوں تک پہنچیں۔

۱: ان کی ان آراء اور مباحث کو ان کے تلامذہ نے اپنی کتابوں میں نقل کیا ، ان کتب کے ذریعے ہم ان کی آراء سے واقف ہوئے ۔

۲: ان کتب کے ذریعے امام کی آراء کا علم ہوا جو ان کی تالیف ہیں ۔ یا ان

کی طرف منسوب ہیں ۔

ابن ندیم کے مطابق ایسی چار کتابیں ہیں جن کی امام ابوحنیفہ کی طرف نسبت کی گئی ۔

۱: الفقہ الاکبر

۲: العالم والمتعلم

۳: ایک رسالہ جو انہوں نے عثمان البتی کو لکھا ، جس میں ایمان کی حقیقت بیان کی گئی اور یہ واضح کیا کہ ایمان اور عمل میں باہمی ربط و تعلق کی نوعیت کیا ہے؟

۴: کتاب الرد علی القدریہ ۔

ان چاروں کتب و رسائل کا مرکزی موضوع عقائد اور کلامی مباحث ہیں(۱۰) ۔

الفقہ الاکبر :

یہاں میں صرف امام صاحب کی ایک تالیف پر گفتگو کروں گا جو "الفقہ الاکبر" کے نام سے موسوم ہے ۔ متکلمین اور اصولیین نے اس تالیف پر خاص توجہ دی ہے ۔ اگرچہ یہ بہت مختصر اور مجمل رسالہ ہے لیکن تمام تر اجمال و اختصار کے باوجود عقائد پر اسے ایک جامع اور مستند تحریر مانا گیا ہے ۔ یہ رسالہ امام صاحب سے مختلف روایات کے ذریعے مروی ہے ۔

۱: روایت حماد بن ابی حنیفہ ۔ حماد ، ابوحنیفہ کے بیٹے ہیں ، اور بیٹا باپ سے جو روایت بیان کرتا ہے وہ بلا واسطہ اور بلا فصل ہوتی ہے ، اور عام حالات میں اس کو مستند مانا جاتا ہے ۔ حماد کے ذریعے امام کی اس تحریر کے استناد کے کے لیے یہی بات کافی ہے کہ ملا علی قاری جیسے جلیل القدر فقیہ و محدث نے اس کی شرح لکھی ۔

۲ : روایت ابی مطیع بلخی ۔ ابو مطیع کی روایت کردہ تحریر "الفقہ الابسط" کے نام سے مشہور ہے ، اور ابو اللیث ثمر قندی ، اور عطاء بن علی جوزجانی نے اس کی شرح لکھی ہے (۱۱) ۔

"الفقہ الاکبر" کے بارے میں علامہ شبلی نعمانی لکھتے ہیں :

"الفقہ الاکبر" عقائد کا مختصر سا رسالہ ہے ، مسائل اور ترتیب قریب قریب وہی ہے جو عقائد نسفی کی ہے ۔ یہ رسالہ دنیا کے مختلف ملکوں میں چھپ گیا ہے ۔ اہل علم نے اس کی شرحیں لکھی ہیں ۔ مثلاً : محی الدین محمد بن بہاؤ الدین (متوفی : ۹۳۵ھ)، مولی الیاس بن ابراہیم اسینیدی ، حکیم اسحاق ، شیخ اکمل الدین (م : ۷۸۹ھ) اور ملا علی قاری ۔

ملا علی قاری کی شرح اہل علم میں مقبول اور متداول ہوئی ۔

حکیم اسحاق کی شرح کو ابوالبقاء احمدی نے ۹۱۸ھ میں نظم کیا ۔ اصل کتاب کو ابراہیم بن حسام نے نظم کیا ، وہ شریفی کے نام سے مشہور ہیں (۱۲) ۔

امام صاحب کے معروف و مستند تذکرہ نگار ابن البزازی "الفقہ الاکبر" کے بارے میں لکھتے ہیں :

"اگر یہ کہا جائے کہ امام ابو حنیفہ نے از خود کوئی کتاب تالیف نہیں کی تو ہم اس کے جواب میں کہیں گے کہ یہ خیال معتزلہ کا ہے ۔ سب سے پہلے انہوں نے یہ دعویٰ کیا کہ امام صاحب نے کوئی کتاب نہیں لکھی ۔ اس بات کے پھیلانے سے ان کی غرض یہ تھی کہ کتاب "الفقہ الاکبر" اور "العالم و المتعلم" کی امام صاحب سے نفی ہو جائے ۔ ان دونوں کتابوں میں اہل سنت والجماعت کے عقائد حقہ کی تثبیت کی گئی ہے ۔ انہوں نے کہا کہ یہ ابو حنیفہ بخاری کی تالیف ہے ۔ مگر معتزلہ

کا یہ دعویٰ سراسر غلط اور بے بنیاد ہے ۔ کیوں کہ میں نے شیخ الملۃ والدین علامہ کردی العمادی کے قلم سے ان دونوں کتابوں پر حواشی لکھے ہوئے دیکھے ہیں ۔ اور یہ بھی لکھا ہوا دیکھا ہے کہ یہ دونوں کتابیں امام اعظم نعمان بن ثابت رحمہ اللہ کی ہیں ۔ اور اس پر مشائخ کی اکثریت متفق ہے ۔" (۱۳)

معتزلہ اور ان کی طرح دوسرے باطل فرقے امام ابو حنیفہ سے مناظروں اور مباحثوں میں بری طرح پسپا ہوئے ، امام ابو حنیفہ کے علم و فضل ، اور اس سے زیادہ ان کی ذہانت طباعی اور نکتہ رسی کے ہاتھوں منحرف گروہ جس طرح لاچار ہو چکے تھے ، ان کے لیے یہ ممکن نہیں تھا کہ وہ عام لوگوں اور اہل علم و فضل کی نظروں میں امام کے مقام و مرتبے کو گرا دیں ۔ جو اہل علم امام کی آراء سے متفق نہیں تھے وہ بھی ان کی علمی عظمت کے قائل تھے ، بلکہ یہ کہنا حقیقت سے قریب تر ہو گا کہ اس دور کے دوسرے فقہا کی نسبت ابو حنیفہ کو زیادہ ہدف تنقید بنانا بذات خود اس بات کی دلیل تھی کہ وہ معاصر فقہاء سے عظیم تر ہیں ۔

معتزلہ عقل پرست تھے ، انہوں نے یہ راہ اپنائی کہ جو تحریر ان کے عقائد پر ضرب لگا رہی تھی اس کے بارے میں یہ کہ دیا کہ یہ ابو حنیفہ نعمان بن ثابت کی تحریر نہیں بلکہ ابو حنیفہ بخاری کی ہے ، تاکہ اس تحریر کے درجہ استناد کو کم کر سکیں ۔

علامہ شبلی نعمانی نے یہ لکھنے کے بعد کہ : "الفقہ الاکبر عقائد کا ایک مختصر سا رسالہ ہے ، مسائل اور ترتیب قریب قریب وہی ہے جو عقائد نسفی کی ہے ، یہ رسالہ چھپ گیا ہے" ۔ یہ عبارت شبلی نعمانی نے "امام صاحب کی تصنیفات کے" زیر عنوان درج کی ہے ۔ یہ بھی اعتراف کیا ہے کہ ، "متعدد اہل علم نے اس کی شرحیں لکھیں" ۔

اس سب کے باوجود پھر یہ بات کہی :

"ہم کیسے یقین کر سکتے ہیں کہ الفقہ الاکبر امام ابو حنیفہ کی تصنیف ہے ۔ یہ کتاب جس زمانہ کی تصنیف بیان کی جاتی ہے کہ اس وقت تک یہ طرز تحریر پیدا نہیں ہوا تھا"۔ (۱۴)

علامہ شبلی نعمانی کی یہ رائے کسی دلیل پر مبنی نہیں ہے ۔ پہلی بات میں یہ کہنا چاہوں گا کہ ایک ہی مصنف کی دو کتابوں کا طرز تحریر بالکل مختلف ہوتا ہے۔ ایک کتاب کی دوسری کتاب سے کوئی مماثلت نہیں ہوتی ۔ یہ بات ہر گز ضروری نہیں کہ ایک مصنف کی تمام کتابوں اور تحریروں کا ایک ہی رنگ اور ایک ہی اسلوب ہو ۔

دوسرے اہل علم کا حوالہ میں بعد میں دوں گا ۔ خود شبلی نعمانی کی دو کتابوں کو سامنے رکھ لیجیے ۔ "سیرۃ النبی "اور "الکلام "، دونوں میں موازنہ کیجیے ۔ دونوں کا موضوع مختلف ، بلکہ بہت زیادہ مختلف ، زبان مختلف ، اندازِ بیان مختلف ، موضوع مختلف ۔ کیا ان بنیادی اختلافات کی بنا پر کوئی یہ کہہ سکتا ہے کہ یہ دونوں کتابیں شبلی نعمانی کی نہیں ہو سکتیں ۔ یا یوں کہا جائے کہ شبلی کا اصل رنگ اور موضوع سیرت نگاری ہے ۔ سیرۃ النبی کے علاوہ ، سیرۃ عمر فاروق اعظم ، سیرۃ النعمان (امام ابو حنیفہ کے حالات و علمی آثار) الغزالی ، یہ ہے شبلی کا میدان ، الکلام اور علم الکلام کو شبلی کی تصنیف کیسے کہا جائے ؟ ۔ لیکن جیسے سیرۃ النبی ، سیرت عمر فاروق ، اور سیرۃ النعمان، شبلی نعمانی کی تصانیف ہیں اسی طرح الکلام اور علم الکلام بھی شبلی ہی کی تصانیف ہیں ۔

مولانا اشرف علی تھانوی کی بیان القرآن جس شخص کے برس ہا برس زیر مطالعہ رہی ہو ، اس کے بعد اس کو بہشتی زیور اور اصلاح الرسوم پڑھوائی جائے تو وہ مشکل سے یقین کرے گا کہ یہ ایک ہی شخص کی تصنیف ہیں ۔

بہشتی زیور اور اصلاح الرسوم جیسی کتابوں کے مصنف کے لیے بیان القرآن جیسی کتاب لکھنا ممکن نہیں ہے اور بیان القرآن کے مصنف کی طرف اصلاح الرسوم کو منسوب کرنا غیر متوازن سی بات ہے ۔

اس طرح بے شمار مثالیں ہیں ۔ کوئی سوچے امام غزالی کی تہافۃ الفلاسفہ اور مکاشفۃ القلوب میں کیا قدرِ مشترک اور باہمی مناسبت ہے ؟

حقیقت یہ ہے کہ "الفقہ الاکبر کی زبان اور اس کا اسلوب بیان ہی اس بات کا گواہ ہے کہ یہ ابوحنیفہ کے دور میں لکھی ہوئی کتاب ہے ۔اس کے اندازِ تحریر میں وہی سادگی ہے جو اسلام کے صدرِ اول میں تھی ۔

علامہ شبلی نعمانی نے یہ بھی تسلیم کیا ہے کہ : فخر الاسلام بزدوی ، اور بحر العلوم مولانا عبد العلی نے "الفقہ الاکبر "کو امام ابو حنیفہ کی طرف منسوب کیا ہے ۔ اور یہ بھی تسلیم کیا کہ ملا علی قاری نے اس کی شرح لکھی ہے ، دنیا کی بیشتر لائبریریوں میں موجود ہے ۔ کیا ملا علی قاری اس درجے کے آدمی تھے کہ انہیں یہ معلوم نہ ہو سکا کہ یہ ابو حنیفہ کی تالیف نہیں ہے ؟

اس حوالہ سے ایک اور بات عرض کروں گا ، وہ یہ کہ عقائد کے بارے میں امام ابو حنیفہ کی جو آراء اور نظریات دوسرے ذرائع سے ملتے ہیں ، کیا ان میں اور الفقہ الاکبر میں درج آراء میں مطابقت ہے یا اختلاف ؟ اگر ان دونوں میں اختلاف ہوتا تو پھر یہ کہا جا سکتا تھا کہ "الفقہ الاکبر "امام کی تالیف نہیں ہے ۔ ان کی طرف منسوب کر دی گئی۔ لیکن یہ حقیقت تمام اہل علم پر عیاں ہے کہ عقائد کے بارے میں امام صاحب کی ان آراء میں جو الفقہ الاکبر کے علاوہ دوسرے ذرائع سے اہل علم تک پہنچیں ، اور ان آراء میں جو الفقہ الاکبر میں مذکور ہیں ، کلی مطابقت ہے ۔زمانے کے تقدم اور تاخر سے جزوی فرق پڑ سکتا ہے ، وہ لائق اعتناء نہیں گردانا جاتا ۔

عقائد کے بارے میں امام صاحب کا جہم بن صفوان کے ساتھ مناظرہ ہوا، یہ مناظرہ طویل بھی ہے اور معرکۃ الآراء بھی، کیوں کہ اس کا تعلق کسی ایک خاص عقیدہ سے نہیں ۔ موفق بن احمد مکی اور ابن عبد البر جیسے ثقہ تذکرہ نگاروں نے اپنی مؤلفات میں اس کو نقل کیا ہے ۔ اس مناظرے کو سنیے، اور پھر "الفقہ الاکبر" کا مطالعہ کیجیے ۔ آپ اس نتیجے پر پہنچیں گے کہ یہ مناظرہ الفقہ الاکبر کا خلاصہ ہے ، یا الفقہ الاکبر اس مناظرے کی ایک واضح تحریری صورت ہے ۔

موفق بن احمد مکی لکھتے ہیں :

"جہم بن صفوان امام صاحب کے ساتھ مناظرے کے لیے آیا"، اس نے کہا: "حنیفہ ! میں تم سے چند مسائل پر گفتگو کرنا چاہتا ہوں"۔

امام صاحب نے جواب دیا : "تمہارے ساتھ گفتگو زیب نہیں دیتی ، تم جن مسائل پر غور و فکر کر رہے ہو وہ بھڑکتی ہوئی آگ ہے "۔

اس نے کہا : آپ نے میری گفتگو نہیں سنی، مجھ سے کبھی ملاقات نہ کی پھر یہ فیصلہ کیسے کر لیا ؟

امام صاحب نے کہا: "یہ باتیں تمہارے متعلق مشہور ہو چکی ہیں اور عام و خاص کو ان کا علم ہو چکا ہے ، اس لیے مجھے تمہارے متعلق کہنے کا حق پہنچتا ہے"۔

جہم نے کہا : "میں تو آپ سے صرف ایمان کے متعلق پوچھنا چاہتا ہوں"۔

امام صاحب نے کہا : "اب تک تم ایمان کو نہیں سمجھ سکے تو مجھ سے کیا پوچھتے ہو"۔

جہم نے کہا : "نہیں یہ بات نہیں ہے ، بلکہ مجھے اس کی ایک قسم کے متعلق شبہ ہے"۔

امام صاحب : "ایمان میں شک کرنا کفر ہے"۔

جہم : "آپ کے لیے یہ جائز نہیں کہ میرے متعلق کفر کا فتویٰ صادر کریں"۔

امام صاحب : "اچھا سوال کرو، کیا پوچھنا چاہتے ہو ؟"۔

جہم : ایک شخص دل سے اعتراف کرتا ہے کہ اللہ ایک ہے ، اس کا نہ کوئی شریک ہے اور نہ ہمسر ، اس کی صفات کو مانتاہے اور یہ کہ اس کی مثل کوئی چیز نہیں ہے ، مگر ان باتوں کا زبان سے اقرار نہیں کرپاتا کہ فوت ہو جائے گا تو کیا اس کی موت ایمان پر ہو گی یا کفر پر ؟

امام صاحب : "ایسا شخص کافر اور جہنمی ہے ، جب تک کوئی شخص دل کے اعتراف کے ساتھ ان باتوں کا زبان سے اقرار نہ کرے وہ مومن نہیں ہو سکتا"۔

جہم : "جب وہ صفاتِ الٰہی کا اعتراف کرتا ہے تو مومن کیسے نہیں ہو سکتا"۔

امام صاحب : "اگر تمہارا قرآن پر ایمان ہے اور تم اسے حجت مانتے ہو تو گفتگو ممکن ہے ، ورنہ ہم اس شخص سے کس طرح گفتگو کر سکتے ہیں ، جو سرے سے ملت اسلام ہی کا منکر ہے "۔

جہم : "میں قرآن پر ایمان رکھتا ہوں اور اسے حجت مانتا ہوں"۔

امام صاحب : قرآن پاک میں اللہ تعالیٰ نے ایمان کا تعلق دو چیزوں سے قرار دیا ہے یعنی دل اور زبان۔

چنانچہ اس آیت کریمہ میں مذکور لوگ :

وَإِذَا سَمِعُوا مَا أُنْزِلَ إِلَى الرَّسُولِ تَرَىٰ أَعْيُنَهُمْ تَفِيضُ مِنَ الدَّمْعِ مِمَّا عَرَفُوا مِنَ الْحَقِّ يَقُولُونَ رَبَّنَا آمَنَّا فَاكْتُبْنَا مَعَ الشَّاهِدِينَ . وَمَا لَنَا لَا نُؤْمِنُ بِاللَّهِ وَمَا

جَآئَنَا مِنَ الْحَقِّ وَ نَطْمَعُ اَنْ یُّدْخِلَنَا رَبُّنَا مَعَ الْقَوْمِ الصّٰلِحِیْنَ ۔ فَاَثَابَهُمُ اللّٰهُ بِمَا قَالُوْا
جَنّٰتٍ تَجْرِیْ مِنْ تَحْتِهَا الْاَنْهٰرُ خٰلِدِیْنَ فِیْهَا وَذٰلِكَ جَزَآءُ الْمُحْسِنِیْنَ ۔ (۱۵)

(یعنی اور وہ جب اسے سنتے ہیں ، جو رسول پر نازل ہوا ، تو آپ ان کی آنکھوں سے آنسو بہتے دیکھتے ہیں ، کیونکہ انہوں نے حق کو پہچان لیا ، وہ کہتے ہیں کہ اے رب ہم مسلمان ہو گئے ، ہمیں ان کے ساتھ لکھ لے جو تصدیق کرتے ہیں اور ہمارے پاس کونسا عذر ہے کہ اللہ تعالیٰ پر اور جو حق ہم پر پہنچا ہے اس پر ایمان نہ لائیں اور یہ امید رکھیں کہ خدا ہمیں نیک لوگوں کے ساتھ داخل کرے گا ، سو ان کو اس قول کے عوض میں خدا ایسے باغ دے گا جن کے نیچے نہریں جاری ہوں گی، یہ ان میں ہمیشہ رہیں گے اور نیکو کاروں کی ایسی ہی جزا ہے)۔

معرفتِ قلب اور اقرارِ لسان کی بنا پر جنت میں پہنچائے گئے ، اور انہیں مومن تسلیم کیا گیا تو اقرار اور تصدیق باللسان کی بنیاد پر ۔

نیز اللہ تعالیٰ فرماتا ہے :

قُوْلُوْٓا اٰمَنَّا بِاللّٰهِ وَمَآ اُنْزِلَ اِلَیْنَا وَمَآ اُنْزِلَ اِلٰٓی اِبْرٰهٖمَ وَاِسْمٰعِیْلَ وَیَعْقُوْبَ وَالْاَسْبَاطِ وَمَآ اُوْتِیَ مُوْسٰی وَ عِیْسٰی وَمَآ اُوْتِیَ النَّبِیُّوْنَ مِنْ رَّبِّهِمْ لَا نُفَرِّقُ بَیْنَ اَحَدٍ مِّنْهُمْ وَنَحْنُ لَهٗ مُسْلِمُوْنَ ۔ فَاِنْ اٰمَنُوْا بِمِثْلِ مَآ اٰمَنْتُمْ بِهٖ فَقَدِ اهْتَدَوْا ۔ (۱۶)

(مسلمانو کہہ دو کہ ہم اللہ پر ایمان رکھتے ہیں اور اس حکم پر جو ہمارے پاس بھیجا گیا ، اور اس پر بھی جو حضرت ابراہیم ، حضرت اسماعیل اور حضرت اسحاق اور حضرت یعقوب اور اولادِ یعقوب کی طرف بھیجا گیا ، اور اس حکم (معجزہ) پر بھی جو حضرت موسیٰ اور حضرت عیسیٰ کو دیا گیا۔ ہم ان میں کوئی فرق نہیں کرتے اور اللہ تعالیٰ کے مطیع ہیں ۔ سو اگر وہ بھی اس طرح ایمان لے آئیں جس طرح تم

(مسلمان) تو وہ بھی راہِ حق پر لگ جائیں گے)۔

نیز فرمایا:

وَاَلْزَمَهُمْ كَلِمَةَ التَّقْوٰی ۔ (۱۷)

(اور اللہ تعالیٰ نے مسلمانوں کو کلمۂ تقویٰ پر جمائے رکھا)۔

نیز فرمایا:

وَهُدُوْٓا اِلَی الطَّیِّبِ مِنَ الْقَوْلِ ۔ (۱۸)

(اور یہ سب انعام ان پر اس لیے ہے کہ کلمۂ طیبہ کے اعتقاد کی ہدایت ہو گئی تھی)۔

نیز فرمایا:

اِلَیْهِ یَصْعَدُ الْكَلِمُ الطَّیِّبُ ۔ (۱۹)

(اچھا کلام اسی تک پہنچتا ہے)۔

نیز فرمایا:

یُثَبِّتُ اللّٰهُ الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا بِالْقَوْلِ الثَّابِتِ فِی الْحَیٰوةِ الدُّنْیَا وَفِی الْاٰخِرَةِ ۔ (۲۰)

(اللہ تعالیٰ ایمان والوں کو اس پکی بات (یعنی کلمۂ طیبہ کی برکت) سے دنیا اور آخرت میں مضبوط رکھتا ہے)۔

اور حدیث میں ہے ، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

قُوْلُوْا لَآ اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ تُفْلِحُوْا ۔

(لا الہ الا اللہ کہو تو فلاح یاب ہو جاؤ گے)

اس حدیث میں فلاح کا دارومدار اقرار باللسان پر ہے اور معرفتِ قلبی پر اکتفا نہیں کیا گیا۔

نیز آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا :

يُخْرِجُ مِنَ النَّارِ مَنْ قَالَ لَا اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ وَكَانَ فِي قَلْبِهِ كَذَا .

(جو شخص زبان سے اللہ تعالیٰ کے ایک ہونے کا اعتراف کرتا ہے اور دل میں بھی یہی عقیدہ رکھتا ہے تو وہ آگ سے نکال لیا جائے گا)

اس حدیث میں بھی صرف دل کے اعتراف پر اکتفا نہیں ہے بلکہ زبان سے اقرار پر نجات معلق ہے۔

اگر صرف اعترافِ قلبی ہی کافی ہوتا اور اقرار باللسان کی ضرورت نہ ہوتی تو جو شخص زبان سے منکر ہو دل سے مانتا ہو اسے بھی مؤمن ہونا چاہیے، تمہارے قول کے مطابق ابلیس لعین تو سب سے بڑا مؤمن ہوگا، کیوں کہ وہ جانتا تھا کہ اللہ ہی اس کا خالق ہے، مارنے والا ہے، دوبارہ زندہ کرنے والا، گمراہ کرنے والا ہے۔ چنانچہ قرآن نے اس کی حکایت بیان کرتے ہوئے فرمایا ہے۔

قَالَ رَبِّ بِمَا اَغْوَيْتَنِي . (۲۱)

(ابلیس نے کہا: اس سبب سے کہ تو نے مجھے گمراہ کیا ہے)

نیز کہا:

اَنْظِرْنِي اِلٰى يَوْمِ يُبْعَثُوْنَ . (۲۲)

(ابلیس نے کہا "اے اللہ مجھے قیامت تک مہلت دے")

یہ بھی کہا:

خَلَقْتَنِي مِنْ نَّارٍ وَخَلَقْتَهُ مِنْ طِيْنٍ . (۲۳)

(ابلیس نے کہا: اے خدا تو نے مجھے آگ سے اور آدم کو مٹی سے پیدا کیا ہے)

اور کفار بھی تو دل سے اللہ کو پہچانتے ہیں مگر زبان سے انکار کرتے ہیں، تو انہیں بھی مؤمن سمجھنا چاہیے، چنانچہ قرآن میں ہے:

وَجَحَدُوْا بِهَا وَاسْتَيْقَنَتْهَا اَنْفُسُهُمْ . (۲۴)

(کافران معجزات کے بارے میں انکار کرتے تھے حالانکہ ان کا دل یقین رکھتا تھا)

مگر باوجود دل سے اقرار کر لینے کے کہ اللہ ایک ہے زبان سے اقرار کی بنا پر انہیں مؤمن قرار نہیں دیا۔

نیز فرمایا:

يَعْرِفُوْنَ نِعْمَتَ اللّٰهِ ثُمَّ يُنْكِرُوْنَهَا وَاَكْثَرُهُمُ الْكَافِرُوْنَ . (۲۵)

دوسرے مقام پر فرمایا:

قُلْ مَنْ يَّرْزُقُكُمْ مِّنَ السَّمَاءِ وَالْاَرْضِ . اَمَّنْ يَّمْلِكُ السَّمْعَ وَالْاَبْصَارَ وَمَنْ يُّخْرِجُ الْحَيَّ مِنَ الْمَيِّتِ وَيُخْرِجُ الْمَيِّتَ مِنَ الْحَيِّ وَمَنْ يُّدَبِّرُ الْاَمْرَ فَسَيَقُوْلُوْنَ اللّٰهُ، فَقُلْ اَفَلَا تَتَّقُوْنَ ، فَذٰلِكُمُ اللّٰهُ رَبُّكُمْ . (۲۶)

(اے نبی) فرما دیجیے کون رزق دیتا ہے تم کو آسمان اور زمین سے؟ یا کون مالک ہے سمع اور ابصار کا، اور کون نکالتا ہے مردہ کو زندہ سے اور کون تدبیر امر کرتا ہے؟ پس جلد کہیں گے، اللہ۔ پس کہہ دیجیے پھر کیوں نہیں ڈرتے، پس یہی تمہارا اللہ ہے جو تمہارا پروردگا ہے۔

ان آیات سے بھی معلوم ہوتا ہے کہ زبان سے انکار کی صورت میں صرف معرفت قلبی بے کار ہے۔

نیز فرمایا:

يَعْرِفُوْنَهُ كَمَا يَعْرِفُوْنَ اَبْنَاءَهُمْ . (۲۷)

(انہیں ایسا ہی پہچانتے ہیں جیسا کہ اپنے بیٹوں کو پہچانتے ہیں)

اس سے معلوم ہوتا ہے کہ انکار و جحود کے ساتھ معرفتِ قلبی بے کار چیز

ہے۔

یہ ساری گفتگو سن کر جہم نے کہا:

"تم نے میرے دل میں کچھ شبہ ڈال دیا ہے اب میں دوبارہ تمہارے پاس آؤں گا"۔ (۲۸)

پھر مکی نے امام صاحبؒ کے اس قول پر کہ اگر کوئی شخص دل سے اعتراف کرے مگر زبان سے اقرار کیے بغیر مر جائے تو وہ کافر ہو گا۔ تعلیق کرتے ہوئے لکھا ہے:

"امام صاحب کے قول کی تاویل یہ ہے کہ جو شخص عدم اقرار سے متہم ہو وہ کفر کی موت مرے گا ورنہ جس شخص پر یہ تہمت نہ ہو مثلاً ایک شخص سمندر کے اندر کسی جزیرے میں یا کسی غار میں مر جاتا ہے تو وہ کافر نہیں ہو سکتا!"۔ (۲۹)

ان تصریحات سے یہ مفہوم ہوتا ہے کہ امام صاحبؒ ایمان کو دو چیزوں سے مرکب مانتے ہیں:

۱۔ اعتقادِ جازم

۲۔ اذعانِ ظاہر

یعنی اعتقادِ جازم کے ساتھ اقرار باللسان بھی ضروری ہے، کیوں کہ اقرار لسانی ہی اذعانِ قلبی کا مظہر بنتا ہے، اسی لیے امام صاحبؒ سے ایمان کی تقسیم کے سلسلے میں مروی ہے کہ دل کے ساتھ یقین کرنے والا دیپتا تو مؤمن ہو سکتا ہے۔ مگر عند الناس وہ مؤمن نہیں ہو سکتا۔

چنانچہ الانتقاء میں امام صاحبؒ سے ایمان اور اس کی اقسام سے متعلق مروی ہے کہ ابو مقاتل امام صاحب سے روایت کرتے ہیں کہ انہوں نے فرمایا:

"ایمان معرفت و تصدیق اور اقرار باللسان دونوں کا نام ہے اور تصدیق کے لحاظ سے مؤمن کی تین قسمیں ہیں۔

۱: بعض تو اللہ تعالیٰ اور رسالت کا دل اور زبان دونوں سے اقرار کرتے ہیں۔

۲: بعض دل سے تصدیق کرتے ہیں مگر زبان سے تکذیب کرتے ہیں۔

۳: اور بعض اس کے برعکس ہیں یعنی وہ زبان سے تصدیق کرتے ہیں، مگر دل سے انکار کرتے ہیں۔

پس جو لوگ دل اور زبان دونوں سے اقرار کرتے ہیں وہ تو اللہ تعالیٰ کے نزدیک بھی مؤمن ہیں اور لوگوں کے نزدیک بھی۔ جو لوگ صرف زبان سے اقرار کرتے ہیں اور دل سے نہیں مانتے، وہ عند اللہ کافر ہیں اور لوگوں کے نزدیک مؤمن، کیونکہ لوگ کسی کے دل کی حالت کو تو نہیں جان سکتے لہٰذا انہیں شہادتِ لسانی کی بنا پر مؤمن مان لینا چاہیے اور دل کی ٹوہ نہیں لگانی چاہیے اور جو شخص تقیہ سے کام لے کر کلمہ کفر کہہ دیتا ہے، وہ لوگوں کے نزدیک کافر ہو گا گو اللہ کے نزدیک مؤمن ہو گا۔ (۳۰)

جہم بن صفوان کے ساتھ امام کے مذکورہ بالا مناظرے سے یہ بات بالکل واضح ہو جاتی ہے کہ الفقہ الاکبر میں عقائد سے متعلق وہی آراء مذکور ہیں جو تاریخی روایات کے ذریعے اہل علم تک پہنچیں اور سب نے ان کو امام صاحب کی طرف منسوب کیا۔

محمد میاں صدیقی
جمادی الآخر ۱۴۱۹ھ
اسلام آباد

مقدمہ

حواشی و حوالہ جات

۱: ذہبی: محمد بن احمد بن عثمان ۔حافظ۔ تذکرہ الحفاظ (طبع: دائرۃ المعارف حیدر آباد دکن ۱۹۵۵ء)۔ ج: ۱، ص: ۳۹۔ طبقہ پنجم۔

۲: محمد ابو زہرہ: استاد۔امام ابو حنیفہ ۔حیاتہٗ، عصرہٗ و آرائہٗ ۔(طبع: لاہور ۱۹۲۶ء) ص: ۲۶۔ (اردو)۔

۳: شبلی نعمانی: سیرۃ النعمان ۔(طبع: ملتان ۔ ت۔ن) ص: ۳۰۔

۴: محمد علی الصدیقی: مولانا۔ امام اعظم اور علم حدیث۔(طبع: سیالکوٹ ۔۱۹۶۶ء)۔ ص: ۸۱

۵: ایضاً۔ نیز سیرۃ النعمان (شبلی نعمانی)۔ امام کے تمام تذکرہ نگاران کے تابعی ہونے کے قائل ہیں۔

۶: سیرۃ النعمان (شبلی)۔ ص: ۸۹، ۹۰۔

۷: ابن خلکان: احمد بن محمد بن ابراہیم۔وفیات الاعیان، (طبع: قاہرہ ۱۹۴۸ء)۔ ج: ۵، ص: ۴۲۔

۸: امام ابو حنیفہ ۔ حیاتہٗ، عصرہٗ و آرائہٗ۔ (محمد ابو زہرہ)۔ ص: ۱۱۵۔

۹: ابن ندیم: محمد بن اسحاق۔ الفہرست ۔(طبع: دارالمعرفہ بیروت ۱۹۷۸ء) ص: ۲۸۵

۱۰: الفہرست (ابن ندیم)۔ ص: ۲۸۵

۱۱: امام ابو حنیفہ ۔(ابو زہرہ)۔ ص: ۳۰۲

۱۲: سیرۃ النعمان (شبلی)۔ ص: ۱۴۳، ۱۴۴

۱۳: امام ابو حنیفہ۔ (ابو زہرہ)۔ ص: ۳۰۲

۱۴: سیرۃ النعمان۔ ص: ۱۴۸

۱۵: القرآن: ۸۳/۵

۱۶: القرآن: ۱۳۶/۲

۱۷: القرآن: ۲۶/۴۸

۱۸: القرآن: ۴۳/۲۲

۱۹: القرآن: ۱۰/۳۵

۲۰: القرآن: ۱۴/ ۲۷

۲۱: القرآن: ۳۹/۱۵

۲۲: القرآن: ۷/ ۱۳

۲۳: القرآن: ۷/ ۱۲

۲۴: القرآن: ۲۷/ ۱۴

۲۵: القرآن: ۱۶/ ۸۳

۲۶: القرآن: ۱۰/ ۳۱

۲۷: القرآن: ۲/ ۱۳۶

۲۸: مناقب امام اعظم (موفق بن احمد مکی)۔ ج: ۱، ص: ۱۴۵۔ ۱۴۸

۲۹: ایضاً۔

۳۰: ابن عبد البر: الانتقاء۔ ص: ۱۷۸، ۱۸۰۔

بسم اللہ الرحمن الرحیم

توحید

(۱) اَصلُ التَّوحِیدِ وَمَا یَصِحُّ الاِعتِقَادُ عَلَیهِ یَجِبُ اَن یَّقُولَ : آمَنتُ بِاللّٰہِ وَمَلَائِکَتِہٖ ، وَکُتُبِہٖ، وَرُسُلِہٖ، وَالبَعثِ بَعدَ المَوتِ ، وَالقَدرِ خَیرِہٖ وَشَرِّہٖ مِنَ اللّٰہِ تَعَالیٰ ، وَالحِسَابِ ، وَالمِیزَانِ ، وَالجَنَّۃِ وَالنَّارِ ، وَذٰلِکَ کُلُّہٗ حَقٌّ.

(ا) توحید کی وہ بنیاد جس پر اس عقیدہ کی مستحکم عمارت استوار ہو ، کے لیے (زبان سے) یہ کہنا ضروری ہے کہ ”میں اللہ پر، اس کی کتابوں پر ، اس کے رسولوں پر ، مرنے کے بعد جی اٹھنے پر ، ہر اچھی اور بری تقدیر کے اللہ تعالیٰ کی طرف سے (مقدر) ہونے پر ، روزِ جزا اور سزا پر ، میزانِ عدل اور جنت اور جہنم پر ایمان لایا“ ۔ اور (دل سے یہ تسلیم کرنا کہ) یہ تمام باتیں حق ہیں ۔

عقائد کے سلسلے میں یہ قاعدہ کلیہ اور اصل الاصول یاد رکھنا ضروری ہے کہ ان پر دل سے ایمان لانا یعنی ان کی تصدیق کرنا اور زبان سے اقرار کرنا لازمی ہے ۔ محض زبان سے اقرار کرنا جب کہ دل ان کی تصدیق پر مائل نہ ہو منافقت

کہلاتا ہے۔ اسی طرح دل تو انہیں تسلیم کرنے پر آمادہ ہو تاہم زبان سے اقرار نہ کیا جائے تو بھی آدمی دائرہ اسلام میں داخل نہیں ہوتا اور مومن نہیں کہلاتا۔

اس پیراگرف میں جن عقائد کا ذکر ہے انہیں ہم تین اقسام میں تقسیم کر سکتے ہیں:

۱۔ توحید ذات و صفات باری تعالیٰ ۔ اس کی تفصیلات آئندہ آرہی ہیں ۔

۲۔ رسالت۔: اس میں انبیاء و رسل ، کتب سماوی اور ملائکہ پر ایمان لانا شامل ہیں ۔

انبیاء کی تعداد کم وبیش ایک لاکھ چوبیس ہزار ہے ، جن میں سے رسولوں کی تعداد تین سو تیرہ ہے ۔ نبی کا لفظی معنی ہے خبر دینے اور راہِ ہدایت دکھانے والا ، جب کہ رسول کا لفظی معنی پیغام پہنچانے والا ہے ۔ وہ نبی جو صاحب شریعت اور صاحب کتاب تھے رسول کہلاتے ہیں ۔ گویا ہر رسول نبی بھی ہے لیکن ہر نبی رسول نہیں ۔

جن انبیاء اور رسل کا ذکر قرآن میں مذکور ہے ان پر نام بنام ایمان لانا اور باقی انبیاء پر بحیثیت مجموعی ایمان لانا ضروری ہے ۔ بعض پرانے اور قدیم مذاہب کے بانی حضرات جیسے زردشت وغیرہ یا بنی اسرائیل کی کتب مقدسہ میں مذکور بعض مذہبی شخصیات کے نبی یا رسول ہونے یا نہ ہونے کے سلسلے میں سکوت اور توقف بہتر ہے ، کیونکہ کسی نبی کی نبوت کا انکار کفر ہے تو کسی غیر نبی کو نبی ماننا بھی کفر ہے ۔ کتب سماوی میں چار آسمانی اور الہامی کتابوں یعنی توریت ، زبور ، انجیل اور قرآن مجید پر ایمان لانا ضروری ہے ۔ البتہ عمل صرف قرآنِ حکیم پر مطلوب اور مقبول ہے ، کیونکہ سابقہ امم کی طرف نازل کردہ کتب اور صحف کی تعلیمات کو مکمل طور پر قرآنِ کریم میں سمو دیا گیا ہے جبکہ موجودہ شکل میں ان کتب کے مندرجات کے بارے میں یقین سے کچھ کہنا مشکل ہے کہ ان کا کون سا حصہ اصلی

حالت پر ہے۔ البتہ ان کتب کا ادب و احترام مسلمانوں پر واجب ہے۔

۳۔ آخرت: اس عقیدہ کے تحت مرنے کے بعد منکر نکیر کا سوال و جواب، عالم برزخ کی زندگی، قیامت، بعث بعد الموت یعنی ارواح کا ان کے جسموں میں پھر سے لوٹایا جانا، حشر نشر، حساب کتاب اور جنت جہنم جیسے عقائد آتے ہیں۔

توحید کا مفہوم

(۲) وَاللّٰهُ تَعَالٰى وَاحِدٌ لاَ مِنْ طَرِيْقِ الْعَدَدِ، وَلٰكِنْ مِنْ طَرِيْقِ اَنَّهُ لاَ شَرِيْكَ لَهُ، لَمْ يَلِدْ وَلَمْ يُوْلَدْ وَلَمْ يَكُنْ لَهُ كُفُوًا اَحَدٌ. لاَ يُشْبِهُ شَيْئًا مِنَ الْاَشْيَاءِ مِنْ خَلْقِهِ وَلاَ يُشْبِهُهُ شَيْءٌ مِنْ خَلْقِهِ لَمْ يَزَلْ وَلَا يَزَالُ بِاَسْمَائِهِ وَصِفَاتِهِ الذَّاتِيَةِ وَالْفِعْلِيَّةِ.

---

(۲) اللہ تعالیٰ ایک ہے۔ لیکن گنتی کے اعتبار سے نہیں بلکہ اس اعتبار سے کہ اس کا کوئی شریک نہیں، نہ اس نے کسی کو جنا اور نہ کوئی اس کا ہمسر ہے۔ وہ اپنی پیدا کردہ چیزوں میں سے کسی بھی چیز کی مانند اور مشابہ نہیں ہے اور نہ ہی اس کی پیدا کردہ چیزوں میں سے کوئی چیز اس کی مانند اور مشابہ ہے۔ وہ اپنے اسمائے حسنٰی اور ذاتی و فعلی صفات کے ساتھ ازل سے ہے اور ابد تک رہے گا۔

گنتی کے اعتبار سے اللہ کے ایک نہ ہونے سے مراد یہ ہے کہ گنتی میں ایک کا ہندسہ اگرچہ ایک ہے لیکن اسے نصف، تہائیوں اور چوتھائیوں وغیرہ میں تقسیم کیا جا سکتا ہے جبکہ ذاتِ باری تعالیٰ تقسیم اور تجزی سے پاک ہے۔

اس کا کوئی شریک اور ہم سر نہیں۔ اس کی مثال کسی بھی محسوس اور غیر محسوس یا خیالی چیز سے نہیں دی جا سکتی۔ نہ تو کوئی اس کی ذات میں شریک ہے کہ اس کا بیٹا ہو یا اس کی تخلیق اللہ تعالیٰ کے نور سے ہوئی ہو۔ کیونکہ اس کی جملہ

مخلوقات غیر ذاتِ باری تعالیٰ ہیں ۔ اس کے نور سے کسی کی تخلیق کا مطلب یہ ہو گا کہ اس کی ذات میں سے کچھ حصہ الگ ہو گیا۔ دوسرے لفظوں میں اس کی ذات میں سے اتنا ہی حصہ کم ہو گیا ، اور یہ محال ہے ۔ اس لیے کہ اللہ تعالیٰ اپنی ذات میں کمی بیشی سے پاک ہے۔

اسی طرح اللہ تعالیٰ اپنی صفات میں بھی یکتا ہے اور ان میں بھی اس کا کوئی شریک نہیں ہے۔ یعنی یہ نہیں ہو سکتا کہ کسی کا علم ، قدرت طاقت اور اختیار وغیرہ اللہ کے علم ، قدرت ،طاقت اور اختیار وغیرہ کے برابر ہو ۔ اس کی مخلوقات میں اس طرح کی صفات نہایت ہی ادنیٰ درجے کی ہیں اور وہ بھی اس کی عطا کردہ ہیں ۔خدا تعالیٰ کے علم و اختیار کے مقابلے میں مخلوقات کا مجموعی علم و اختیار وغیرہ بھی سمندروں کے مقابلے میں ایک قطرے سے بھی کم تر حیثیت کا ہوتا ہے ۔

ذاتی اور فعلی صفات

(۳) اَمَّا الزَّاتِيَةُ فَالْحَيَاةُ وَالْقُدْرَةُ وَالْعِلْمُ وَالْكَلَامُ وَالسَّمْعُ وَالْبَصَرُ وَالْاِرَادَةُ . وَاَمَّا الْفِعْلِيَّةُ فَالتَّخْلِيْقُ وَالتَّرْزِيْقُ وَالْاِنْشَاءُ وَالْاِبْدَاعُ وَالصُّنْعُ وَغَيْرُ ذٰلِكَ مِنْ صِفَاتِ الْفِعْلِ لَمْ يَزَلْ وَلَا يَزَالُ بِصِفَاتِهٖ وَاَسْمَائِهٖ لَمْ يَحْدُثْ لَهُ صِفَةٌ وَلَا اِسْمٌ .

---

(۳) اللہ تعالیٰ کے ذاتی صفات ہیں : اس کا زندہ ہونا ، اس کی قدرت ، اس کا علم ، اس کا سننا اور دیکھنا اور اس کا ارادہ ۔ جبکہ اس کی فعلی صفات میں اس کی صفتِ تخلیق ، اس کا رازق ہونا ، اس کی صفاتِ انشاء ، ابداع اور صنعت گری وغیرہ جیسی وہ صفات شامل ہیں جن سے اس کا فعال ہونا ثابت ہوتا ہے ۔ وہ اپنی ان جملہ صفات اور اسمائے حسنیٰ کے ساتھ ازل سے ہے اور ابد تک رہے گا ،اور اس کی کوئی بھی صفت یا نام حادث نہیں ہے ۔

اللہ تعالیٰ کی صفات دو طرح کی ہیں :

۱: ذاتی ۔
۲: فعلی۔

دونوں طرح کی صفات اس کی ذات کی طرح قدیم ہیں ۔

ذاتی صفات سے مراد ایسی صفات ہیں جو اس کی ذات کے ساتھ ہمیشہ

سے متصل ہیں اور اس سے وہ صفات کسی بھی لمحہ کے لیے جدا نہیں ہو سکتے ۔ اللہ تعالیٰ اپنی ان ذاتی صفات کے ساتھ ہمیشہ سے اور ہمیشہ کے لیے بالقوۃ اور بالفعل متصف ہے۔

فعلی صفات سے مراد وہ صفات ہیں جن کا ظہور تب ہوتا ہے جب وہ اس کی مخلوق پر واقع ہوتی ہیں اور ان کے حق میں اس کا نتیجہ اچھے یا برے، نعمت یا نقمت ، رحمت یا زحمت کی صورت میں ظاہر ہوتا ہے ۔ یہ صفات اللہ تعالیٰ کے ساتھ بالقوۃ ازل سے متصل چلے آرہے ہیں اور ان کا اظہار بالفعل وقتاً فوقتاً ہوتا رہتا ہے۔

جس طرح اس کی ذات کی مثال کسی مخلوق سے نہیں دی جا سکتی ، اسی طرح اس کی جملہ صفات کامل ، مکمل اور اکمل ہونے میں اس کی مخلوقات کے ناقص اور نامکمل صفات سے ممتاز اور ممیز ہیں اور انہیں مخلوقات کی ناقص صفات پر قیاس نہیں کیا جا سکتا۔

صفاتِ الٰہی کا ازلی ہونا

(٤) لَمْ يَزَلْ عَالِمًا بِعِلْمِهِ وَالْعِلْمُ صِفَةٌ فِي الْأَزَلِ وَقَادِرًا بِقُدْرَتِهِ وَالْقُدْرَةُ فِي الْأَزَلِ وَمُتَكَلِّمًا بِكَلَامِهِ وَالْكَلَامُ صِفَةٌ فِي الْأَزَلِ وَخَالِقًا بِتَخْلِيقِهِ وَالتَّخْلِيقُ صِفَةٌ فِي الْأَزَلِ وَفَاعِلًا بِفِعْلِهِ وَالْفِعْلُ صِفَةٌ فِي الْأَزَلِ وَالْفَاعِلُ هُوَ اللّٰهُ تَعَالٰى وَالْفِعْلُ صِفَةٌ فِي الْأَزَلِ وَالْمَفْعُوْلُ مَخْلُوْقٌ وَفِعْلُ اللّٰهِ تَعَالٰى غَيْرُ مَخْلُوْقٍ .

---

(۴) وہ اپنی صفت علم سے ہمیشہ سے متصف چلا آرہا ہے اور اس کا علم اسی کی طرح قدیم ہے ۔ وہ اپنی قدرتِ کاملہ کے ساتھ ہمیشہ سے متصف چلا آرہا ہے اور اس کی قدرت اسی کی طرح قدیم ہے ۔ وہ اپنی صفت کلام سے ہمیشہ سے متصف چلا آرہا ہے اور اس کی صفت کلام اسی کی طرح قدیم ہے۔ وہ اپنی صفت خلق سے ہمیشہ سے متصف چلا آرہا ہے اور اس کی صفت تخلیق اسی کی طرح قدیم ہے ۔ وہ اپنی صفت فعل کے ساتھ ہمیشہ سے متصف چلا آرہا ہے اور اس کی صفت فعل اسی کی طرح قدیم ہے ۔ (کائنات میں جو کچھ ہوتا ہے اس کا) کرنے والا اللہ تعالیٰ ہے اور اس کی یہ صفت اسی کی طرح قدیم ہے ۔ اس کے فعل کا محل وقوع (مفعول) مخلوق ہے جبکہ اللہ تعالیٰ کا فعل غیر مخلوق ہے ۔

اللہ تعالیٰ کی صفات کا تعلق چونکہ خود ذاتِ باری تعالیٰ سے ہے لہٰذا وہ بھی ہر لحاظ سے اسی کی طرح قدیم اور ازلی ہیں۔ جبکہ اس کی وہ صفات جن کا تعلق اس کے فعل سے ہے اس کی ذات کی نسبت سے تو قدیم اور ازلی ہیں البتہ اس کی مخلوق پر ان کو وارد اور واقع ہونے کے اثرات کے اعتبار سے خود مخلوقات کے لیے وہ حادث ہیں۔ اللہ تعالیٰ کے فعل کے غیر مخلوق ہونے اور مفعول جس پر فعل واقع ہوا ہے اس کے مخلوق ہونے سے یہی مراد ہے۔مزید تفصیل آگے آرہی ہے۔

(نوٹ) حادث سے مراد ہے نئی چیز، جس کا پہلے سے وجود نہ ہو۔ تمام مخلوقات حادث ہیں، صرف ذات و صفات باری تعالیٰ حادث نہیں بلکہ قدیم ہیں اور یہاں پر قدیم سے مراد ازلی اور ابدی ہونا ہے۔

قدامت صفات و ذات باری تعالیٰ

(۵) وَصِفَاتُهُ فِي الْأَزَلِ غَيْرُ مُحْدَثَةٍ وَلَا مَخْلُوقَةٍ وَمَنْ قَالَ إِنَّهَا مَخْلُوقَةٌ أَوْ مُحْدَثَةٌ أَوْ وَقَفَ أَوْ شَكَّ فِيهِمَا فَهُوَ كَافِرٌ بِاللّٰهِ تَعَالٰى.

---

(۵) اللہ تعالیٰ کی تمام صفاتِ ازلی نہ تو حادث ہیں اور نہ ہی مخلوق، جو یہ کہے کہ یہ مخلوق ہیں یا حادث ہیں یا اس کے بارے میں توقف کرے یا کسی شک و شبہ میں مبتلا ہو وہ اللہ تعالیٰ کا منکر ہے۔

عقیدہ کا درست ہونا، پختہ ہونا اور شکوک و شبہات سے پاک ہونا ضروری ہے۔ عقیدہ کی مثال بیج کی ہے، اگر کوئی شخص زمین ہموار کرتا ہے، اس پر ہل چلاتا ہے، اس میں کیاریاں اور نالیاں بناتا ہے، پھر اسے پانی دیتا ہے، مگر اس میں بیج نہیں ڈالتا تو اس کے یہ تمام اعمال بیکار جائیں گے، اور وہ کچھ بھی کاٹنے کے قابل نہیں ہو گا۔ اگر وہ ان تمام اچھے اعمال کے بعد کوئی نقصان دہ یا بے فائدہ پودوں وغیرہ کا بیج بوئے گا تب بھی ببول اور کانٹے ہی اس کے نصیب میں ہوں گے۔ نیز جو شخص اس طرح کے اعمالِ صالحہ کے بعد ناقص اور کرم خوردہ بیج بوئے گا وہ بھی مطلوبہ فائدہ سے محروم رہے گا۔ بعینہٖ عقیدہ تمام اعمالِ صالحہ کے بار آور ہونے کے لیے لازمی اور ضروری ہے۔ پھر یہ عقیدہ درست بھی ہونا چاہئے اور ہر قسم کے شک و شبہ سے پاک ہونا چاہیے، تب جا کر انسان اپنے اعمالِ صالحہ کا پھل پانے کی امید رکھ سکتا ہے۔

قرآن مجید کلام اللہ

(٦) وَالْقُرْآنُ كَلَامُ اللّٰهِ تَعَالٰى ، فِي الْمَصَاحِفِ مَكْتُوْبٌ وَفِي الْقُلُوْبِ مَحْفُوْظٌ وَعَلَى الْأَلْسُنِ مَقْرُوْءٌ وَعَلَى النَّبِيِّ عَلَيْهِ الصَّلٰوةُ وَالسَّلَامُ مُنَزَّلٌ وَلَفْظُنَا بِالْقُرْآنِ مَخْلُوْقٌ وَكِتَابَتُنَا لَهٗ مَخْلُوْقَةٌ وَقِرَائَتُنَا لَهٗ مَخْلُوْقَةٌ وَالْقُرْآنُ غَيْرُ مَخْلُوْقٍ .

(٦) قرآن مجید اللہ تعالیٰ کا کلام ہے جو مصاحف میں لکھا ہوا ہے ، دلوں میں محفوظ ہے ، زبان سے اسے پڑھا جاتا ہے اور نبی کریم ﷺ پر اتارا گیا ہے ۔ ہم اپنی زبان سے قرآن مجید کے جو الفاظ ادا کرتے ہیں وہ مخلوق ہیں ، نیز ہمارا قرآن مجید کو تحریر کرنے کا عمل بھی مخلوق ہے اور ہمارا قرآن مجید کو تلاوت کرنے کا عمل بھی مخلوق ہے ، لیکن خود قرآن مجید (بحیثیت کلام اللہ) غیر مخلوق ہے ۔

معتزلہ قرآن کریم کو حادث اور مخلوق مانتے تھے ،لیکن ہمارا عقیدہ یہ ہے کہ قرآن مجید اللہ تعالیٰ کا کلام ہے اور اللہ کا کلام اس کی صفت ہے ، اور اس کی جملہ صفات ازلی ، قدیم اور غیر مخلوق ہیں ، اس لیے کہ اللہ تعالیٰ ازل سے اپنی ذات و صفات کے اعتبار سے کامل ، مکمل اور اکمل چلا آرہا ہے ۔ اور وہ اپنی ذات و صفات میں کسی بھی قسم کی کمی ، خامی اور نقص سے ہمیشہ سے پاک ہے ۔ کوئی دور ایسا نہیں آیا جب اس کی ذات میں کسی چیز کی کمی تھی جو بعد میں پوری ہوئی ہو یا

اس کی کوئی صفت نامکمل تھی جو بعد میں مکمل ہوئی ہو ، لہٰذا اس کی جملہ صفات کی طرح اس کا کلام بھی قدیم اور غیر مخلوق ہے ۔

البتہ ہم جب قرآن مجید کی تلاوت کرتے ہیں تو یہ ہمارا عمل ہے ۔چونکہ ہم مخلوق ہیں لہٰذا ہمارا یہ عمل بھی حادث اور مخلوق ہے ۔نیز الفاظ کو تحریر کرنے کے لیے ہم نے حروف کی جو علامات وضع کی ہیں وہ بھی ہماری اپنی ایجاد کردہ ہیں جن کی شکل و صورت میں ضرورت کے لیے یا خوشنمائی کے لیے اکثر و بیشتر ہم تبدیلی کرتے رہتے ہیں ،وہ بھی مخلوق اور حادث ہیں ۔اسی طرح کاغذ ، روشنائی ، قلم اور قرطاس وغیرہ بھی مخلوق اور حادث ہیں ۔ لہٰذا مصاحف میں تحریر شدہ قرآن کریم کے حروف الفاظ اور جملہ مادی اشیاء مخلوق ہیں ۔

قرآن میں مذکور غیر اللہ کا کلام

(۷) وَمَا ذَكَرَهُ اللّٰهُ تَعَالٰى فِى الْقُرْآنِ حِكَايَةً عَنْ مُوْسٰى وَغَيْرِهٖ مِنَ الْاَنْبِيَاءِ عَلَيْهِمُ السَّلَامُ وَعَنْ فِرْعَوْنَ وَاِبْلِيْسَ فَاِنَّ ذٰلِكَ كُلَّهٗ كَلَامُ اللّٰهِ تَعَالٰى اِخْبَارًا عَنْهُمْ وَكَلَامُ اللّٰهِ تَعَالٰى غَيْرُ مَخْلُوْقٍ وَكَلَامُ مُوسٰى وَغَيْرِهٖ مِنَ الْمَخْلُوْقِيْنَ مَخْلُوْقٌ وَالْقُرْآنُ كَلَامُ اللّٰهِ تَعَالٰى فَهُوَ قَدِيْمٌ لَا كَلَامُهُمْ.

---

(۷) قرآن مجید میں اللہ تعالیٰ نے حضرت موسیٰ اور دیگر انبیاء علیہ السلام نیز فرعون اور ابلیس کی جو باتیں ذکر کی ہیں وہ سب کی سب باتیں اللہ تعالیٰ کا کلام ہیں جس میں ان کی کہی ہوئی باتوں کی خبر دی گئی ہے۔ اب جہاں تک اللہ تعالیٰ کے کلام کا تعلق ہے تو وہ غیر مخلوق ہے۔ البتہ حضرت موسیٰ اور دیگر مخلوقات کا کلام مخلوق ہے۔ قرآن مجید اللہ کا کلام ہے اور قدیم، لیکن ان مخلوقات کا کلام قدیم نہیں (بلکہ حادث) ہے۔

قرآن مجید از ابتداء سورۃ فاتحہ تا انتہاء سورۃ الناس پورا کا پورا اللہ کا کلام ہے جو امثال و حکم، وعدہ اور وعید، محکم اور متشابہ، اوامر و نواہی، عقائد و ایمانیات، مواعظ و نصائح اور قصص و حکایات جیسے مختلف اور متنوع مضامین پر مشتمل ہے۔ قرآن کریم میں جا بجا انبیاء و رسل اور صالحین امم سابقہ کی باتوں اور ان کے کلام کو بھی بیان کیا گیا ہے۔ نیز بعض دشمنانِ خدا جیسے ابلیس، فرعون، یہود

و نصاریٰ اور کفار و مشرکین کی باتیں اور اعتراضات بھی اس میں بیان ہوئی ہیں۔ قرآن کریم کی وہ آیات جن میں خدا کی مخلوقات کا کلام مذکور ہے وہ بھی کلام اللہ ہیں اور اسی کی طرح قدیم ہیں۔ چونکہ اللہ تعالیٰ کا علم بے کراں، لامحدود اور ازلی اور ابدی ہے، لہٰذا اللہ تعالیٰ ازل ہی سے اپنے اس وسیع علم کے ذریعے نہ صرف ان کے کلام اور گفتگو کو لفظ بلفظ جانتے تھے بلکہ ان کے انداز و اطوار گفتگو، لب و لہجہ اور نیتوں اور ارادوں تک سے واقف تھے، اس لیے اللہ تعالیٰ نے اپنے جس کلام میں بظاہر ان کی طرف سے ان کی جن باتوں کو بیان کیا ہے اس کا وہ کلام بھی ازلی اور قدیم ہے۔ البتہ ان مخلوقات نے اپنے اپنے وقت پر اپنی زبان سے جب بھی کلام ادا کیا تو ان کا یہ کلام خود ان کی طرح مخلوق ہے۔

یہ تصور کرنا ہرگز درست نہ ہوگا کہ انبیاء، فرشتوں یا ابلیس اور فرعون وغیرہ جب یہ گفتگو کر چکے تو یہ باتیں اللہ کے علم میں آئیں اور پھر اللہ تعالیٰ نے انہیں اپنی کتاب میں نقل کیا۔ اس سے اللہ تعالیٰ کے علم کے ناقص اور نامکمل ہونے کا تصور پیدا ہوتا ہے جو درست نہیں۔ کیونکہ ایسی کوئی ہستی خدا بننے کی اہل نہیں ہو سکتی جس کا علم ناقص اور نامکمل ہو یا حادث ہو۔ اللہ تعالیٰ ایسے تمام عیوب سے پاک اور بلند و برتر ہستی ہے۔

کلام اللہ اور کلام غیر اللہ

(۸) سَمِعَ مُوْسٰی عَلَیْهِ السَّلاَمُ کَلاَمَ اللّٰهِ تَعَالٰی کَمَا فِی قَوْلِهٖ تَعَالٰی (وَکَلَّمَ اللّٰهُ مُوْسٰی تَکْلِیْمًا) وَقَدْ کَانَ اللّٰهُ تَعَالٰی مُتَکَلِّمًا وَلَمْ یَکُنْ کَلَّمَ مُوْسٰی عَلَیْهِ السَّلاَمُ وَقَدْ کَانَ اللّٰهُ تَعَالٰی خَالِقًا فِی الْاَزَلِ وَلَمْ یَخْلُقِ الْخَلْقَ فَلَمَّا کَلَّمَ اللّٰهُ مُوْسٰی کَلَّمَهُ بِکَلاَمِهِ الَّذِیْ هُوَ لَهُ صِفَةٌ فِی الْاَزَلِ .

---

(۸) موسیٰ علیہ السلام نے اللہ تعالیٰ ہی کے کلام کو سنا تھا، جیسا کہ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں: اور اللہ نے موسیٰ سے کلام کیا۔ (اس کی) حقیقت یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے یہ کلام اس وقت کیا تھا جب ابھی اس نے موسیٰ سے گفتگو بھی نہیں کی تھی۔ جیسا کہ اللہ تعالیٰ ازل میں اس وقت بھی خالق تھا جب کہ ابھی اس نے کسی چیز کو تخلیق نہیں کیا تھا۔ لہٰذا اللہ تعالیٰ نے موسیٰ علیہ السلام سے گفتگو کی تو اپنے کلام کے ساتھ گفتگو کی جو اللہ تعالیٰ کی صفتِ ازلی ہے۔

گزشتہ پیراگراف میں عربی متن اور ترجمہ اور تشریح کے ضمن میں جو کچھ بیان ہوا ہے، یہاں پر اس کی مزید تشریح و توضیح کی جا رہی ہے۔ تقریباً بارہویں صدی قبل مسیح میں حضرت موسیٰ علیہ السلام نے کوہِ طور اور وادی طویٰ

میں اللہ تعالیٰ کا جو کلام سنا تھا وہ وہی ازلی کلام تھا جو خود ذاتِ باری تعالیٰ کی طرح قدیم ہے۔ جیسا کہ اس نے جب ابھی کسی ایک بھی چیز کو تخلیق نہیں کیا تھا تب بھی وہ خلاق عالم تھا اور وہ اس صفت کے ساتھ ازل سے متصف ہے۔ اسی طرح وہ اپنے صفت کلام سے بھی ازل سے متصف ہے خواہ مخلوقات کے اعتبار سے اس کا ظہور اور وقوع موسیٰ علیہ السلام سے گفتگو کرتے وقت بارہویں صدی قبل مسیح ہو یا فخر موجودات رحمۃ للعالمین خاتم النبیین فداہ نفسی و روحی ﷺ پر ساتویں صدی عیسوی کے شروع میں نزول قرآن مجید کے وقت۔ اللہ تعالیٰ کی دو صفات المقدم اور المؤخر ہیں جن کا مطلب یہ ہے کہ وہ اپنی مشیت اور ارادہ کے تحت کسی واقعہ کو پہلے لانے یا کسی واقعہ کو مؤخر کرنے پر قادر ہے۔ اسی طرح اللہ تعالیٰ کی دو صفات القابض اور الباسط ہیں جن کا مطلب یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ چیزوں کو سمیٹنے اور سکیڑنے پر بھی قادر ہے اور چیزوں کو پھیلانے اور وسعت دینے پر بھی۔ چونکہ وقت بھی ان اشیاء میں شامل ہے، لہٰذا اللہ تعالیٰ اس پر قادر ہے کہ وہ اپنا ازلی کلام اس قدر سست رفتاری سے چلا دیں یا وقت کو اس قدر وسعت دیدیں اور پھیلا دیں کہ جب وہ کلام اس مطلوبہ شخص یا ہستی تک پہنچے تو وہ وہی وقت ہو جب اسے اس کلام کو اللہ تعالیٰ کی تقدیر کے مطابق سنائی دینا چاہیے۔ مادی دنیا سے ہم اس کی مثال سورج چاند ستاروں کی روشنی سے دے سکتے ہیں جو اپنے منبع سے چلنے کے بعد ہم تک کئی منٹوں یا گھنٹوں کے بعد پہنچتی ہے۔

یکتا صفات ربانی

(۹) وَصِفَاتُهٗ كُلُّهَا بِخِلَافِ صِفَاتِ الْمَخْلُوْقِيْنَ . يَعْلَمُ لَا كَعِلْمِنَا ، وَيَقْدِرُ لَا كَقُدْرَتِنَا وَيَرٰى لَا كَرُؤْيَتِنَا وَيَتَكَلَّمُ لَا كَكَلَامِنَا وَيَسْمَعُ لَا كَسَمْعِنَا. وَنَحْنُ نَتَكَلَّمُ بِالْاٰلَاتِ وَالْحُرُوْفِ وَاللّٰهُ تَعَالٰى يَتَكَلَّمُ بِلَا آلَةٍ وَلَا حُرُوْفٍ وَالْحُرُوْفُ مَخْلُوْقَةٌ وَكَلَامُ اللّٰهِ تَعَالٰى غَيْرُ مَخْلُوْقٍ .

---

(۹) اس کی تمام صفات مخلوقات کی صفات سے ممتاز اور ممیز ہیں ۔ وہ جانتا ہے لیکن ہمارے جاننے کی طرح نہیں ، وہ قدرت رکھتا ہے لیکن ہماری قدرت کی طرز پر نہیں ، وہ دیکھتا ہے لیکن ہمارے دیکھنے کے انداز میں نہیں ، وہ بولتا ہے لیکن ہمارے بولنے کے طریقے پر نہیں، وہ سنتا ہے لیکن ہمارے سننے کے طریقے پر نہیں ۔ (مثلاً) ہم آلات (اعضاء و جوارح) اور حروف کی مدد سے گفتگو کرتے ہیں ، جبکہ اللہ تعالیٰ بغیر آلات اور حروف کے کلام کرتا ہے۔ کیونکہ حروف مخلوق ہیں جبکہ اللہ تعالیٰ کا کلام غیر مخلوق ہے ۔

اللہ تعالیٰ کی جملہ صفات اس کی مخلوقات میں موجود صفات سے بالکل جدا، ممتاز اور بلند و برتر ہیں ۔ مثلاً انسان دیگر حیوانات کی طرح دیکھنے اور سننے جیسی

صفات میں بے شمار مادی اشیاء ، آلات اور اعضاء کا محتاج ہے ۔ مثلاً اگر آنکھیں نہ ہوں یا آنکھوں کا جملہ نظام ٹھیک نہ ہو یا پھر خارجی ذریعہ جیسے روشنی نہ ہو تو ہم دیکھ نہیں سکیں گے ۔ اس طرح اگر کان نہ ہوں یا کان کے اندرونی نظام میں کوئی خرابی ہو یا پھر خارجی وسیلہ یعنی ہوا نہ ہو تو ہم سن نہیں سکیں گے ۔ اس کے علاوہ ہماری ان صفات کا دائرہ کار نہایت ہی محدود ہے ، ہم بہت سی مادی چیزیں اپنی ٹھیک ٹھاک آنکھوں سے نہیں دیکھ سکتے ، بے شمار آوازیں ایسی ہیں جنہیں ہم صحیح و سالم کانوں سے بھی نہیں سن سکتے ۔ لیکن اللہ تعالیٰ کی صفاتِ رویت اور سماعت نہ تو آلات و اعضاء کی محتاج ہے اور نہ دیگر مادی اور غیر مادی اشیاء کی ۔ اس کا علم اور اس کی قدرت وسیع اور لامحدود ہیں اور وہ اپنے علم کے لیے ہماری طرح حواسِ خمسہ اور دماغ کا اور اپنی قدرتِ کاملہ کے لیے اعضاء و جوارح کا محتاج نہیں ہے۔

عدم تجسیم خدا تعالیٰ

(۱۰) وَهُوَ شَيْءٌ لاَ كَا لاَ شْيَاءِ وَمَعْنَى الشَّيْءِ الثَّابِتُ بِلاَ جِسْمٍ وَلاَ جَوْهَرٍ وَلاَ عَرَضٍ وَلاَ حَدَّ لَهُ وَلَا ضِدَّ لَهُ وَلَا نِدَّ لَهُ وَلاَ مِثْلَ لَهُ.

---

(۱۰) اللہ تعالیٰ بھی ایک شے (چیز) ہے لیکن دیگر اشیاء کی طرح نہیں ہے ۔ اور اس شے سے مراد وہ موجودہ ہستی ہے جس کا کوئی جسم نہیں ہے اور نہ ہی وہ عرض ہے ۔ (اسی طرح)اس کی کوئی حد ہے نہ ضد ہے،اور نہ ہی کوئی اس کے برابر اور اس جیسا ہے ۔

کائنات میں موجود جملہ مادی اور غیر مادی اشیاء کی پہچان اور شناخت کے لیے چند خصوصیات ضروری ہوتی ہیں ۔ مثلاً ان کا ایک جسم ہوتا ہے جو مختلف اجزاء سے مل کر بنتا ہے ۔ جسم کے یہ اجزاء بذاتِ خود الگ جسم کے طور پر بھی اپنا وجود اور اپنی شناخت رکھتے ہیں ۔ جیسے ہم انسان کی مثال لیتے ہیں : انسان کا ایک جسم ہے جو لاکھوں بافتوں کا مجموعہ ہے ۔ یہ بافتیں لاتعداد خلیوں سے مل کر بنتی ہیں۔ ہر خلیہ اپنی جگہ ایک مکمل جسم ہے جو بے شمار مالیکیولز سے مل کر بنتا ہے ۔ ہر مالیکیول اپنی جگہ ایک مکمل جسم ہے جو متعدد ایٹمز سے مل کر بنتا ہے ۔ ہر ایٹم اپنی جگہ ایک مکمل جسم ہے جو بہت سے نیوٹران ، پروٹان ، الیکٹران اور پارٹیکلز سے مل کر بنتا ہے ۔اس مرحلہ پر الیکٹران ، نیوٹران اور پروٹان وغیرہ اپنا وجود بر قرار رکھنے

کے لیے ایک دوسرے کے محتاج ہوتے ہیں، جبکہ خود ایٹم کا وجود ان کا محتاج ہے ۔
مالیکیولز ایٹوں کے بغیر وجود میں نہیں آسکتے ، خلیے اپنا وجود بر قرار رکھنے کے لیے مالیکیولز کے محتاج ہیں ، بافتوں کا وجود خلیوں کا مرہونِ منت ہے اور خود انسان کا وجود ان بافتوں کے ایک ہم آہنگ اور مربوط نظام کا محتاج ہے ۔ گویا اجسام کے لیے محتاجی کا ایک ختم نہ ہونے والا سلسلہ قائم ہے ۔ جبکہ اللہ تعالیٰ کسی بھی قسم کی احتیاج سے پاک ہے ۔اللہ کی صفات الغنی اور الصمد کا یہی مفہوم ہے کہ وہ ذاتِ یکتا صفات ہر طرح سے بے نیاز ہے ۔

کسی بھی جسم کو مکمل طور پر جاننے کا ایک اہم ذریعہ اور طریقہ اس کی ضد کو جاننا ہے۔عربی مقولہ ہے :"تعرف الاشیاء باضدادھا" یعنی چیزوں کو ان کی ضد اور بالمقابل اشیاء سے پہچانا جاتا ہے ۔ چونکہ ذاتِ باری تعالیٰ جسم نہیں رکھتا لہٰذا اس کا نہ کوئی ضد ہے اور نہ ہی کوئی مثل یعنی اس جیسا ۔ "لیس کمثلہ شئی" اس کی مثال کسی بھی مادی اور غیر مادی چیز سے نہیں دی جا سکتی ۔

اسی طرح اس کے لیے حدود متعین کرنا کہ وہ کسی مخصوص جگہ پر ہے اس کے محدود کرنے کے مترادف ہے ۔ جبکہ اللہ تعالیٰ اپنی ذات و صفات کے اعتبار سے لا محدود ہے ۔ کیونکہ جس چیز کے بھی حدود متعین ہو سکتے ہوں اس میں ابھی اضافہ کی گنجائش ہوتی ہے اور یہ بات کسی چیز کے نامکمل ہونے کی دلیل ہوتی ہے حالانکہ اللہ تعالیٰ کی ذات بھی مکمل ہے اور اس کی صفات بھی مکمل ہیں ۔

الله تعالیٰ کے ہاتھ اور چہرہ کا بیان

(۱۱) وَلَهُ يَدٌ وَوَجْهٌ وَنَفْسٌ كَمَا ذَكَرَهُ اللّٰهُ تَعَالىٰ فِي الْقُرْآنِ. فَمَا ذَكَرَهُ اللّٰهُ تَعَالىٰ فِي الْقُرْآنِ مِنْ ذِكْرِ الْوَجْهِ وَالْيَدِ وَالنَّفْسِ فَهُوَ لَهُ صِفَاتٌ بِلَا كَيْفٍ وَلَا يُقَالُ اَنَّ يَدَهُ قُدْرَتُهُ اَوْ نِعْمَتُهُ لِاَنَّ فِيهِ اِبْطَالَ الصِّفَةِ . وَهُوَ قَوْلُ اَهْلِ الْقَدَرِ وَالْاِعْتِزَالِ وَلٰكِنْ يَدُهُ صِفَتُهُ بِلَا كَيْفٍ وَغَضَبُهُ وَرِضَاهُ صِفَتَانِ مِنْ صِفَاتِ اللّٰهِ تَعَالىٰ بِلَا كَيْفٍ .

---

(۱۱) اس کا ہاتھ بھی ہے، چہرہ بھی اور نفس بھی، جس طرح کہ اللہ تعالیٰ نے قرآنِ کریم میں اپنے لیے جسم چہرہ ، ہاتھ اور نفس کا ذکر کیا ہے وہ اس کی ایسی صفات ہیں جن کی کیفیت ہمیں معلوم نہیں ۔ لیکن یہ کہنا درست نہ ہو گا کہ اس کے ہاتھ سے مراد اس کی قدرت یا اسکی نعمت ہے ، کیونکہ اس طرح اس صفت کا ابطال لازم آئے گا ۔ اور یہ قدریہ اور معتزلہ کا عقیدہ ہے ۔ لہٰذا (درست عقیدہ یہ ہے کہ) اس کا ہاتھ اس کی وہ وصف ہے جس کی کیفیت ہم نہیں جانتے ۔ اسی طرح اللہ تعالیٰ کی ناراضگی اور خوشی اس کی ان صفات میں سے دو ایسی صفتیں ہیں جن کی کیفیت ہمیں معلوم نہیں ۔

اللہ تعالیٰ کی وہ صفات جو انسانی جسم کا خاصہ ہیں اور لوازم ہیں جیسے ہاتھ ، چہرہ اور نفس یا جن کا تعلق بعض انسانی اعضاء سے ہے ، جیسے غصہ اور خوشی وغیرہ تو ان کی صفات کی تاویل اور توجیہ اس طرح کرنا کہ اس سے خود ان الفاظ کا مفہوم ہی لغو اور باطل ہو جائے درست نہیں ہے ۔ ہم ان صفات پر اسی معنی اور مفہوم میں ایمان رکھتے ہیں جو ان الفاظ کو سن کر فوراً ہی ذہن میں آجاتے ہیں ، البتہ ان کی حقیقت اور کیفیت ہماری قوتِ ادراک سے بلند و برتر شے ہے ۔ اسی کو ایمان بالغیب کہتے ہیں ۔

معتزلہ نے ان صفات کی جو توجیہ کی ہے وہ اس لیے بھی درست نہیں کہ اللہ تعالیٰ کے پاس الفاظ کی کوئی کمی نہیں تھی اور وہ چاہتے تو مثلاً ہاتھ کو الفاظ کے بجائے قدرت یا نعمت کے الفاظ سے اپنی اس صفت کو بیان کر سکتے تھے ۔ مگر اس کے باوجود اللہ تعالیٰ نے ہاتھ ، چہرے اور نفس کے لیے مستعمل عربی الفاظ ہی سے اپنی ان صفات کو بیان کیا ہے ۔ لہٰذا کوئی وجہ نہیں کہ ان الفاظ کو ان کی حقیقت پر محمول نہ کیا جائے ، اس لیے ہمیں دورازکار تاویلات میں پڑنے کی ضرورت نہیں کیونکہ ہم اس کے مکلف نہیں ہیں ۔ بلکہ اللہ تعالیٰ نے اس طرح کی متشابہات میں غور و خوض کو ان لوگوں کا شیوہ قرار دیا ہے جن کے دلوں میں کجی اور ٹیڑھا پن ہوتا ہے ۔

قضاء و قدر (۱)

(۱۲) خَلَقَ اللّٰهُ تَعَالٰی الْاَشْیَاءَ لَا مِنْ شَیْءٍ وَکَانَ اللّٰهُ تَعَالٰی عَالِمًا فِی الْاَزَلِ بِالْاَشْیَاءِ قَبْلَ کَوْنِهَا . وَهُوَ الَّذِیْ قَدَّرَ الْاَشْیَاءَ وَقَضَاهَا وَلَا یَکُوْنُ فِی الدُّنْیَا وَلَا فِی الْآخِرَةِ شَیْءٌ اِلَّا بِمَشِیْئَتِهٖ وَعِلْمِهٖ وَقَضَائِهٖ وَقَدَرِهٖ وَکُتُبِهٖ فِی اللَّوْحِ الْمَحْفُوْظِ وَلٰکِنْ کَتَبَهٗ بِالْوَصْفِ لَا بِالْحُکْمِ .

(۱۲) اللہ تعالیٰ ہی اشیاء کو عدم سے وجود میں لایا اور ان اشیاء کے وجود میں آنے سے پہلے اللہ تعالیٰ ازل سے ان کے بارے میں پورا پورا علم رکھتے تھے ۔ اسی نے ان اشیاء کو مقدر فرمایا اور انہیں اتمام تک پہنچایا ۔ دنیا اور آخرت میں اس کی مرضی اور مشیت ، اس کے علم اور قضاء وقدر اور لوح محفوظ میں اس کے تحریر کردہ طریقے سے ہٹ کر نہ تو کچھ ہوتا ہے اور نہ ہو گا ۔ البتہ لوح محفوظ میں اس کی تحریر باعتبار وصف کے ہے نہ کہ حکم کے ۔

اللہ تعالیٰ کی صفات البدیع ، المبدی اور الفاطر کا معنی اشیاء کو عدم سے وجود میں لانے والے کے ہیں ۔ جبکہ الخالق، الباری اور المصور کا معنی پہلے سے موجودمادہ سے کسی نئی شکل و صورت اور خصوصیات و صفات والی چیز کا پیدا کرنے

والا ہے ۔

تقدیر کا لفظی معنی ہے اندازہ لگانا اور قضا کا لفظی معنی ہے فیصلہ کر دینا ۔

قضاء و قدر زیادہ تر مترادف معنوں میں استعمال کیے جاتے ہیں لیکن ان دونوں میں حقیقتاً فرق ہے ۔ قدر یا تقدیر سے مراد کسی شخص کا اپنے علم ، شے معلوم کی فطرت وخصوصیت اور حالات و واقعات کا رخ دیکھ کر ایک اندازہ قائم کرنا کہ فلاں وقت پر اس شے کی کیفیت کیا ہو گی اور عمل ورد عمل کے طبعی اصول کے نتیجے میں اس پر کیا گزرے گی ۔ جبکہ قضاء سے مراد کسی شخص کا اپنے علم، شے معلوم کی فطرت وخصوصیت اور حالات و واقعات کے تقاضوں کو ملحوظ رکھتے ہوئے فیصلہ کردینا کہ فلاں وقت پر اس شے سے فلاں کام لیا جائے گا اور پھر عمل اوررد عمل کے طبعی اصول کے نتیجہ میں اس سے فلاں فلاں نتائج حاصل کیے جائیں گے ۔

بعض اہل علم کے نزدیک تقدیر سے مراد تدبیر ہے ، جیسا کہ مشہور لغوی الزجاج اور مفسر قرآن قاضی بیضاوی فرماتے ہیں جبکہ ان کے نزدیک قضاء اس تدبیر کو عملی جامہ پہنانے کا نام ہے ۔

لوح محفوظ میں اللہ تعالیٰ نے ہر چیز کے بارے میں ہر بات لکھ دی ہے جس سے کوئی چیز سر مو بھی انحراف نہیں کر سکتی ۔ جیسا کہ الیکٹرانک اشیاء یا کسی بھی مشین کے چھوٹے بڑے تمام پرزوں کے بارے میں ان پرزوں کو بنانے اور انہیں اسمبل کرنے والے نے جو رول اور کردار ان کے لیے متعین کر دیا ہے وہ اس سے انحراف نہیں کر سکتے ۔ یہ اصول کائنات کی ہر شے پر صادق آتا ہے بشمول فرشتوں کے ۔ البتہ جب اللہ تعالیٰ نے انسانوں کو پیدا کرنے کا فیصلہ کیا تو اس نے انہیں ایک طرح کا اختیار دینے سے متعلق اپنے ارادے کا فرشتوں کے سامنے اظہار فرمایا۔ انسانوں کے اسی اختیار پر فرشتے معترض ہوئے اور اپنے خدشات اور اندیشوں کا اظہار کرنے لگے ۔ لیکن انسانوں کے اختیار کا دائرہ بہر حال محدود اور

متعین ہے جس سے تجاوز کرنا ان کے بس میں نہیں ہے ۔ مثلاً ان کی پیدائش اور موت ان کے اختیار میں نہیں ہے ۔ وہ از خود کسی خاندان یا کسی مخصوص والدین کے ہاں پیدا ہونے کا اختیار نہیں رکھتے یا اس دنیا میں آنے کے لیے کسی خاص وقت اور زمانے کو منتخب کرنے کا اختیار بھی انہیں حاصل نہیں ہے۔ انہیں اپنی موت کے وقت کو مقدم و مؤخر کرنے کی قدرت حاصل نہیں ہے ۔ وہ خود کو شیر چیتے یا پرندے کی شکل میں ڈھال نہیں سکتے ، وہ بغیر کسی وسیلے کے اڑنے پر قادر نہیں ہیں وغیرہ وغیرہ ۔ جبکہ وہ اپنی مرضی سے جو زبان سیکھنا چاہیں سیکھ سکتے ہیں ، جو ہنر یا فن اپنانا چاہیں اپنا سکتے ہیں ، روزگار کے لیے جس پیشے کو چاہیں منتخب کر سکتے ہیں ، جس مذہب کو چاہیں اس کی پیروی کر سکتے ہیں ۔ اللہ تعالیٰ نے انہیں اچھے اور برے کی تمیز عطا کی ہے ، اب وہ اپنی مرضی سے جس راہ پر چلنا چاہیں چل سکتے ہیں ۔ اسی اختیار کو بروئے کار لا کر وہ جزاء یا سزاء ، ثواب یا عقاب ، جنت یا جہنم کا حقدار بنتے ہیں ۔

قضاء و قدر (۲)

(۱۳) وَالْقَضَاءُ وَالْقَدَرُ وَالْمَشِيْئَةُ صِفَاتُهُ فِي الْاَزَلِ بِلَا كَيْفٍ يَعْلَمُ اللّٰهُ تَعَالٰى الْمَعْدُوْمَ فِيْ حَالِ عَدَمِهِ مَعْدُوْمًا وَيَعْلَمُ اَنَّهُ كَيْفَ يَكُوْنُ اِذَا اَوْجَدَهُ وَيَعْلَمُ اللّٰهُ الْمَوْجُوْدَ فِيْ حَالِ وُجُوْدِهِ مَوْجُوْدًا وَيَعْلَمُ اَنَّهُ كَيْفَ يَكُوْنُ فَنَاؤُهُ . وَيَعْلَمُ اللّٰهُ الْقَائِمَ فِيْ حَالِ قِيَامِهِ قَائِمًا وَاِذَا قَعَدَ فَقَدْ عَلِمَهُ قَاعِدًا فِي حَالِ قُعُوْدِهِ مِنْ غَيْرِ اَنْ يَّتَغَيَّرَ عِلْمُهُ اَوْ يَحْدُثَ لَهُ عِلْمٌ وَلٰكِنِ التَّغَيُّرُ وَالْاِخْتِلَافُ يَحْدُثُ عِنْدَ الْمَخْلُوْقِيْنَ .

---

(۱۳) قضاء و قدر اور مشیت (الٰہی) اللہ تعالیٰ کی وہ ازلی صفات ہیں جن کی کیفیت ہمیں معلوم نہیں ۔ اللہ تعالیٰ معدوم شے کو اس وقت بھی جانتا ہے جب وہ ابھی سرے سے وجود ہی میں نہیں آیا ہوتا ، اور یہ بھی جانتا ہے کہ وہ شے معدوم کو جب وجود میں لائے گا تو وہ کیسا ہو گا اور اللہ تعالیٰ موجود شے کی موجودگی کو حالتِ وجود میں بھی جانتا ہے اور یہ بھی جانتا ہے کہ وہ شے موجود کس طرح فنا ہو گا ۔ اللہ تعالیٰ کھڑے ہوئے شے کی حالت قیام کو بوقتِ قیام بھی جانتا ہے اور جب وہ بیٹھتا ہے تو اس وقت اس کی اس حالتِ قعود کو بھی جانتا ہے ۔ بغیر اس کے کہ اس سے اس کے علم میں کوئی تغیر رونما ہو یا اسے کوئی نیا علم حاصل

ہو۔ تغیر و تبدیلی کا رونما ہونا اور نئی صورتحال کا پیدا ہونا صرف مخلوقات کے نزدیک (خود ان کی ذات کے اعتبار سے) واقع ہوتا ہے۔

کائنات میں اب تک جو کچھ ہوتا رہا ہے، ہو رہا ہے یا آئندہ ہو گا، یعنی ماضی، حال اور مستقبل کے واقعات، ہم مخلوق کے اعتبار سے ماضی، حال اور مستقبل کے واقعات ہیں۔ کیونکہ ہمارے نزدیک وقت کے پیمانے نہایت ہی محدود ہیں۔ ہم وقت کو سیکنڈوں، منٹوں، گھنٹوں، دنوں، ہفتوں، مہینوں، سالوں اور صدیوں کے پیمانوں سے ناپتے ہیں اور ہم میں سے بہت کم لوگ ہیں جو پوری ایک صدی کے پیمانہ وقت کو گزرتا ہوا دیکھنے کے قابل ہو سکتے ہوں۔ ہمارا پیمانہ وقت محدود ہونے کے ساتھ ساتھ ایک مستقل بالذات شے بھی نہیں ہے بلکہ ایک نسبتی اور اضافیت والی شے ہے۔ یعنی ہم وقت کو سورج کے گرد زمین کے مداری اور محوری گردش کے حوالے سے ناپتے ہیں۔ اس کی محوری گردش سے دن رات بنتے ہیں اور مداری گردش سے ماہ و سال وجود میں آتے ہیں۔ ہماری دنیا بہت محدود ہے، ہماری اس دنیا سے کہیں بڑی لاکھوں دنیائیں اس لا محدود کائنات کا حصہ ہیں۔ اس کے مقابلے میں خالق کائنات کی لا محدود ذات کی طرح اس کے جملہ پیمانہ ہائے صفات بھی لا محدود ہیں۔ لہٰذا اس کے ہاں وقت کا پیمانہ نہ تو ہمارے محدود پیمانوں کی طرح محدود ہے اور نہ ہی اس کے نزدیک وقت کوئی نسبتی اور اضافیت والی شے ہے۔ اس پہلو سے اگر ہم غور کریں تو جو حقیقت ہم پر منکشف ہوتی ہے وہ یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کے نزدیک وقت تھما ہوا اور ایک جگہ رکا ہوا ہے۔ لہٰذا اس کے نزدیک نہ تو کوئی زمانہ ماضی ہے اور نہ مستقبل ہے، بلکہ سارا زمانہ حال ہی حال ہے۔ اس کی مثال یوں دی جا سکتی ہے کہ اگر دو گاڑیاں ایک دوسرے کے ساتھ ساتھ ایک سمت میں یکساں رفتار سے چل رہی ہوں اور ان کے ڈرائیور اردگرد سے بے

نیاز ہو کے صرف ایک دوسرے پر نظر رکھیں تو ان کے لیے وہ گاڑیاں ایک ہی جگہ پر رکی ہوئی لگیں گی۔ اسی اصول کو مد نظر رکھتے ہوئے سائنس دانوں نے زمین کے گرد خلاء میں بعض ایسے مصنوعی سیارے پہنچا دیے ہیں جن کی زمین کے گرد گھومنے کی رفتار بعینہٖ وہی ہے جو خود زمین کی اپنے محور پر گھومنے کی رفتار ہے۔ اس طرح وہ مصنوعی سیارے حرکت کرنے کے باوجود اپنی جگہ ساکت اور ٹھہرے ہوئے معلوم ہوتے ہیں اور اسی وجہ سے انہیں ساکت سیارے (Stationary Satellites) کے نام سے پکارا جاتا ہے۔

اس ساری گفتگو سے یہ بات واضح ہو گئی ہو گی کہ نئے واقعات کا پیش آنا یا ان واقعات کے پیش آنے پر نئی معلومات کا حاصل ہونا ہمارے نزدیک وقت کے محدود پیمانوں کی وجہ سے ہوتا ہے۔ چونکہ اللہ تعالیٰ کے نزدیک وقت کا پیمانہ لا محدود ہونے کی وجہ سے ماضی اور مستقبل نام کا کوئی زمانہ سرے سے موجود ہی نہیں ہے، لہٰذا اللہ تعالیٰ کے اعتبار سے نہ کوئی واقعہ نیا ہے اور نہ ہی پرانا۔ اس لیے اللہ تعالیٰ کے ازلی علم میں نہ کوئی اضافہ ہوتا ہے نہ کوئی تبدیلی ہوتی ہے اور نہ ہی کوئی تغیر۔ یہ سب کچھ ہمارے اعتبار سے ہوتا ہے، اس لیے بعض اوقات اللہ تعالیٰ نے ہمیں بہت سی باتیں سمجھانے کی غرض سے ہمارے اعتبارات کو ملحوظ رکھتے ہوئے ماضی اور مستقبل کے حوالے سے قرآن مجید میں بعض واقعات اور امور کا ذکر کیا ہے اور انہیں اسی تناظر میں دیکھنا چاہیے۔

کفر اور ایمان

(١٤) خَلَقَ اللّٰهُ تَعَالیٰ الْخَلْقَ سَلِیْمًا مِنَ الْکُفْرِ وَالْاِیْمَانِ ثُمَّ خَاطَبَهُمْ وَاَمَرَهُمْ وَنَهَاهُمْ فَکَفَرَ مَنْ کَفَرَ بِفِعْلِهٖ وَاِنْکَارِهٖ وَجُحُوْدِهِ الْحَقَّ بِخِذْلَانِ اللّٰهِ تَعَالیٰ اِیَّاهُ وَآمَنَ مَنْ آمَنَ بِفِعْلِهٖ وَاِقْرَارِهٖ وَتَصْدِیْقِهٖ بِتَوْفِیْقِ اللّٰهِ تَعَالیٰ اِیَّاهُ وَنُصْرَتِهٖ لَهٗ .

(۱۴) اللہ تعالیٰ نے مخلوقات کو کفر اور ایمان (دونوں) سے عاری پیدا کیا ہے ۔ پھر ان سے خطاب کر کے انہیں (بعض باتوں کا) حکم دیا اور (بعض باتوں سے) منع کیا ۔ پھر اللہ تعالیٰ کی مدد اور توفیق جس کے شاملِ حال ہوئی اس نے اپنی مرضی اور اختیار سے حق کی تصدیق کی اور اقرار کر کے ایمان سے سرفراز ہوا ۔

کوئی ماہر کاریگر جب ایک ہی قسم کی بے شمار چیزیں بنانا چاہتا ہے تو وہ ان کے لیے ایک ہی طرح کے خام مال کا انتخاب کرتا ہے ، پھر اس خام مال کو ایک ہی جیسے مراحل سے گزار کر اس قابل بناتا ہے کہ اس سے یکساں خصوصیات اور صلاحیتوں والی متعدد اشیاء تیار ہو سکیں پھر اس مواد سے اپنی لاجواب کاریگری کے ذریعے بالکل ہی ایک نئی شکل و صورت والے لاتعداد شاہکار تخلیق کرتا ہے ۔ ان تمام باتوں کے باوجود بعض اوقات چند اشیاء میں خود ان میں موجود کسی خامی کی وجہ سے اپنی قسم کی دیگر اشیاء سے کم تر درجے کی، یا پھر سرے سے متضاد خصوصیات

والی چیزیں وجود میں آجاتی ہیں ۔ ظاہر ہے ماہر کاریگر ان کی تخلیق کے تمام مراحل سے بخوبی آگاہ ہوتا ہے اور وہ جانتا ہے کہ کون کون سے مرحلے میں کن وجوہ اور اسباب کی بنا پر کس کس چیز میں کیا خامی یا کمی رہ گئی ہے اور آئندہ وہ کس حد تک کارآمد اور مفید یا نقصان دہ ثابت ہو سکتے ہیں ۔ یہی وجہ ہے کہ اپنی ہی تخلیق کردہ بعض چیزوں کی اس کی نظر میں قدر و قیمت زیادہ ہوتی ہے اور بعض کی کم ۔ پھر انہی خصوصیات اور صفات کی بنا پر وہ بعض کو صاف ستھرے اور پاکیزہ مقاصد کے لیے مخصوص کر دیتا ہے اور وہ اچھے اور عمدہ ترین مقامات پر رکھے جاتے ہیں ، ان کی حفاظت کا خصوصی اہتمام ہوتا ہے اور ہر دیکھنے والی نظر میں ان کے لیے تحسین و آفرین کے جذبات موجزن رہتے ہیں ۔ اسی قسم سے تعلق رکھنے والی بعض دوسری چیزوں کو وہ ان میں موجود خصوصیات ہی کی بنیاد پر نہایت ہی حقیر اور معمولی کاموں کے لیے مخصوص کر دیتا ہے اور وہ اہم اور اچھے مقامات سے دور رکھے جاتے ہیں اور کوئی بھی ان کی طرف نظر بھر کر دیکھنا گوارا نہیں کرتا ۔

خالقِ جن و انس کا معاملہ بھی اس ماہر کاریگر جیسا ہے بلکہ اس سے کہیں بڑھ کر ہے۔ کیونکہ اس کی جملہ صفات کامل ، مکمل اور اکمل ترین ہیں لہٰذا وہ اپنے بندوں کے بارے میں خوب جانتا ہے کہ کس میں توفیقِ الٰہی سے مستفید ہونے کی صلاحیت ہے اور کس میں نہیں ۔ بھلا کسی نے دنیا میں کوئی ایسا زمیندار بھی دیکھا ہے جو زرخیز زمین کو چھوڑ کر تھور زدہ زمین کی آبیاری کرتا ہو ؟ جب کوئی بھی ہوش مند زمیندار اپنی زمینوں میں ایسا نہیں کرتا تو پھر اللہ تعالیٰ کسی ایسے شخص کو ہدایت کی توفیق کیوں عطا کرے جس کے بارے میں وہ خوب جانتا ہے کہ اسے توفیق بخشنا یا نہ بخشنا یکساں ہے۔

وعدہ الست

(١٥) اَخْرَجَ ذُرِّيَّةَ آدَمَ مِنْ صُلْبِهٖ فَجَعَلَهُمْ عُقَلَاءَ فَخَاطَبَهُمْ وَاَمَرَهُمْ بِالْاِيْمَانِ وَنَهَاهُمْ عَنِ الْكُفْرِ فَاَقَرُّوْا لَهٗ بِالرُّبُوْبِيَّةِ فَكَانَ ذٰلِكَ مِنْهُمْ اِيْمَانًا فَهُمْ يُوْلَدُوْنَ عَلٰى تِلْكَ الْفِطْرَةِ وَمَنْ كَفَرَ بَعْدَ ذٰلِكَ فَقَدْ بَدَّلَ وَغَيَّرَ وَمَنْ آمَنَ وَصَدَّقَ فَقَدْ ثَبَتَ عَلَيْهِ وَدَاوَمَ .

---

(۱۵) اللہ تعالیٰ نے آدم کی اولاد کو اس کی پیٹھ سے نکال کر انہیں عقل عطا کی اور پھر ان سے خطاب کر کے انہیں ایمان لانے کا حکم دیا اور کفر سے منع فرمایا (جس پر) انہوں نے اللہ تعالیٰ کی ربوبیت کا اقرار کیا اور اس طرح وہ ایمان لے آئے اور وہ اسی دینِ فطرت پر پیدا ہوتے ہیں۔ پھر جو شخص کفر کرتا ہے وہ در اصل اپنی اس فطرت کو تبدیل کر کے ایمان کو کفر سے بدل ڈالتا ہے۔ اور جو شخص ایمان لاتا ہے اور حق کی تصدیق کرتا ہے، وہ گویا اسی دینِ فطرت پر ثابت قدم رہتا اور مداومت اختیار کرتا ہے۔

اللہ تعالیٰ نے آدم علیہ السلام کو پیدا کرنے کے بعد اس کی قیامت تک آنے والی اولاد کی ارواح کو بھی تخلیق کیا اور پھر ان سب کو مخاطب کر کے پوچھا کیا میں تمہارا رب نہیں ہوں؟ سب نے اس کے جوب میں اللہ کی ربوبیت کا اقرار

کیا۔ گویا اللہ کی ربوبیت کا اقرار انسانوں کی فطرت میں شامل ہے اور وہ اس فطرت کے مطابق پیدا کیے جاتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ سے کیے گئے وعدہ اور اقرار کی یاد دہانی کے لیے اللہ تعالیٰ نے ایک طرف تو کائنات میں بے شمار نشانیاں رکھ دی ہیں جو پکار پکار کر اس کے رب ہونے کا اعلان کر رہی ہیں اور دوسری طرف اللہ تعالیٰ نے وقتاً فوقتاً انبیاء و رسل مبعوث کیے اور انہیں معجزات اور نشانیاں دے کر بھیجا۔ اس سلسلے کی آخری کڑی حضرت محمد ﷺ ہیں اور آپ ؐ کو جو معجزہ عطا کیا گیا وہ قرآن مجید ہے جس کا اعجاز سابقہ انبیاء کے وقتی معجزوں کے بر عکس ہمیشہ کے لیے قائم و دائم ہے۔ کیونکہ یہ خود اللہ کا کلام ہے اور اس میں دلائل و براہین کے ساتھ اللہ کی ربوبیت کو ثابت کیا گیا ہے۔

اللہ تعالیٰ کی ربوبیت کے انکار کی بنیادی وجہ فطرت کو تبدیل کرنا اور بگاڑنا ہے۔ اور جہاں بھی اور جب بھی فطرت کو تبدیل کرنے یا اسے بگاڑنے کی کوشش کی گئی اس کے اثرات ہمیشہ منفی نکلے۔ فطرت میں بگاڑ اور فساد کے اسباب میں والدین کی غلط تربیت، ماحول کے برے اثرات، تعلیم کی کمی اور جہالت، دنیاوی اغراض کو فوقیت اور مادی ترجیحات و میلانات کی شدت وغیرہ شامل ہیں۔

اللہ تعالیٰ نے دونوں راستے دکھا دیے ہیں اور اب یہ انسان کا کام ہے کہ اپنی ترجیحات کا تعین اس طرح کرے کہ اپنی آخرت کو اپنی دنیا پر قربان نہ کر بیٹھے۔

ایمان اور فطرت

(١٦) ولَمْ يُجبِرْ اَحدًا مِنْ خَلْقِهِ عَلَى الكُفْرِ ولاَ عَلَى الْاِيْمَان ولاَ خَلَقَهُمْ مُؤمِنًا ولاَ كَافِرًا ولَكِنْ خَلَقَهُمْ اَشْخَاصًا ، والْاِيْمَانُ والْكُفرُ فِعْلُ الْعِبَادِ . ويَعْلَمُ اللّٰهُ تعَالَى مَن يَكْفُرُ فِيْ حَالِ كُفْرِهِ كَافِرًا فَاِذَا آمَنَ بَعْدَ ذٰلِكَ عَلِمَهُ مُؤمِنًا فِيْ حَالِ اِيْمَانِهِ واَحَبَّهُ مِنْ غَيْرِ اَنْ يَّتَغَيَّرَ عِلْمُهُ وَصِفَتُهُ .

(۱۶) اللہ تعالیٰ نے اپنی مخلوق میں سے نہ تو کسی کو کفر پر مجبور کیا ہے اور نہ ہی ایمان لانے پر۔ اسی طرح نہ تو اس نے انھیں مومن پیدا کیا ہے اور نہ ہی کافر، بلکہ انھیں محض ان کی شناخت دے کر پیدا کیا ہے، جبکہ ایمان اور کفر بندوں کا اپنا اختیاری فعل ہے۔ البتہ اللہ تعالیٰ کو کفر کرنے والے کے کفر کا جب وہ کافر ہوتا ہے پورا پورا علم ہوتا ہے اور پھر جب وہ ایمان لاتا ہے تو حالتِ ایمان میں اس کے ایمان کا پورا پورا علم ہوتا ہے اور وہ اس کو پسند کرتا ہے۔ لیکن اس طرح نہ تو اس کے علم میں کوئی تبدیلی واقع ہوتی ہے اور نہ ہی اس کے اس صفت میں کوئی تغیر رونما ہوتا ہے۔

ہر پیدا ہونے والا بچہ فطرت کے مطابق پیدا ہوتا ہے۔ تاہم پیدائش کے

وقت نہ تو وہ مومن ہوتا ہے اور نہ ہی کافر، بلکہ اس میں خیر و شر میں سے ہر ایک کو قبول کرنے کی صلاحیت موجود ہوتی ہے۔ گویا ایمان اور کفر میں سے جس راستے کا بھی آدمی انتخاب کرتا ہے وہ سراسر اس کا اپنا انتخاب اور اس کی اپنی پسند ہوتی ہے۔

اللہ تعالیٰ نہ تو کسی کو ایمان پر مجبور کرتا ہے اور نہ ہی کفر پر، کیونکہ دین کے معاملے میں اکراہ اور زبردستی کو اللہ تعالیٰ بالکل پسند نہیں کرتا۔ تاہم جب کوئی شخص ایمان لاتا ہے تو اللہ تعالیٰ اس کے دل میں ایمان کی محبت اور قدر و منزلت بڑھا دیتا ہے اور کفر و عصیان کو اس کے لیے ناپسندیدہ بنا دیتا ہے، اور جو شخص کفر و طغیان کا راستہ اپناتا ہے تو اللہ تعالیٰ اسے ڈھیل دے دیتا ہے یہاں تک کہ وہ اپنی حالت پر مطمئن اور خوش رہتا ہے۔ لیکن اللہ تعالیٰ کسی کے کفر کو پسندیدگی کی نگاہ سے نہیں دیکھتا جبکہ ایمان لانے کے عمل کو وہ پسند کرتا ہے اور اس پر خوش ہوتا ہے۔

ارادہ و مشیت خداوندی

(۱۷) وَجَمِيْعُ اَفْعَالِ الْعِبَادِ مِنَ الْحَرَكَةِ وَالسُّكُوْنِ كَسْبُهُمْ عَلَى الْحَقِيْقَةِ وَاللّٰهُ تَعَالٰى خَالِقُهَا ، وَهِيَ كُلُّهَا بِمَشِيْئَتِهٖ وَعِلْمِهٖ وَقَضَائِهٖ وَقَدَرِهٖ . وَالطَّاعَاتُ كُلُّهَا كَانَتْ وَاْجِبَةً بِاَمْرِ اللّٰهِ تَعَالٰى وَبِمَحَبَّتِهٖ وَبِرَضَائِهٖ وَعِلْمِهٖ وَمَشِيْئَتِهٖ وَقَضَائِهٖ وَتَقْدِيْرِهٖ . وَالْمَعَاصِيْ كُلُّهَا بِعِلْمِهٖ وَقَضَائِهٖ وَتَقْدِيْرِهٖ وَمَشِيْئَتِهٖ لاَ بِمَحَبَّتِهٖ وَلاَ بِرَضَائِهٖ وَلاَ بِاَمْرِهٖ .

---

(۱۷) بندوں کے تمام افعال از قسم حرکت و سکون حقیقتاً ان کے خود کردہ ہیں جبکہ ان کا خالق اللہ تعالیٰ ہے۔ یہ تمام کے تمام افعال اللہ تعالیٰ کی مشیت ، اس کے علم اور قضاء و قدر کے تحت سرزد ہوتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ کی اطاعت و فرماں برداری والے کاموں کے پیچھے اس کا حکم، اس کی پسندیدگی اور رضامندی ، اس کا علم و مشیت اور قضاء و قدر کار فرما ہوتے ہیں جبکہ اس کی نافرمانی والے کام اس کے علم و مشیت اور قضاء و قدر کے تحت ضرور سرزد ہوتے ہیں مگر ان کے ساتھ اس کی پسندیدگی اور رضامندی اور اس کا حکم شاملِ حال نہیں ہوتے۔

انسانوں کے جملہ افعال ، خواہ وہ ان کے عادی افعال ہوں جیسے چلنا پھرنا

، سونا جاگنا وغیرہ یا طاعت و فرماں برداری والے اعمال ہوں یا سرکشی اور نافرمانی پر مبنی اعمال ، ان کی نسبت اگر خود ان کے کرنے والے کی طرف کی جائے تو اپنے ان افعال کا کرنے والا وہ خود ہوتا ہے۔ کیونکہ وہ جو کچھ بھی کرتا ہے اپنے ارادے اور اپنی قدرت و اختیار سے کرتا ہے۔ لیکن جب انہی اعمال و افعال کو اللہ تعالیٰ کی قدرت و ارادے کے حوالے سے دیکھا جائے تو ان کا خالق اللہ تعالیٰ ہی قرار پاتا ہے۔ اس کی مثال کسی خودکار مشین اور اور اس کے آپریٹر سے دی جا سکتی ہے ، کہ اس مشین کے بہت سے پرزے خودکار طریقے سے اپنا اپنا مقررہ کام انجام دیتے رہتے ہیں تاہم ان کی جملہ سرگرمیوں کے پیچھے اس کے آپریٹر کا ہاتھ ہوتا ہے اور وہ اس مشین اور اس کے متعلقہ حصے اور پرزے اس کی مرضی و منشا اور حکم واختیار کے مطابق کام کر رہے ہوتے ہیں۔ اب اگر یہ مشین اور اس کے پرزے اپنے آپریٹر کے حسبِ منشا کام کریں تو اس میں اس کا ارادہ ، حکم اور رضامندی ، تینوں شامل ہوتے ہیں۔ لیکن اگر مشین کے پرزے اس کے حسبِ منشاء کام نہ کریں تو ان کے چلنے میں اس آپریٹر کا حکم اور ارادہ تو شامل ہوتا ہے مگر اس کی رضامندی شامل نہیں ہوتی۔

اسی طرح جو لوگ اللہ تعالیٰ کی اطاعت و فرماں برداری کے کام کرتے ہیں ان کے ان کاموں میں اللہ کا ارادہ ، اس کا حکم ، اس کی خوشی اور رضامندی سب شامل ہوتے ہیں۔ لیکن اس کی نافرمانی کے کاموں میں اللہ کا ارادہ تو شامل ہوتا ہے مگر اس کی خوشی اور رضامندی شامل نہیں ہوتی۔

عصمت انبیاء

(۱۸) وَالْاَنْبِيَاءُ عَلَيْهِمُ الصَّلَاةُ وَالسَّلَامُ كُلُّهُمْ مُنَزَّهُوْنَ عَنِ الصَّغَائِرِ وَالْكُفْرِ وَالْقَبَائِحِ ، وَقَدْ كَانَتْ مِنْهُمْ زَلَّاتٌ وَخَطَايَا .

---

(۱۸) تمام کے تمام انبیاء کرام علیہم الصلوٰۃ والسلام گناہوں، کفر اور دیگر برائیوں سے پاک ہوتے ہیں ۔ البتہ ان سے بعض لغزشیں اور غلطیاں ضرور سرزد ہوئی ہیں ۔

انبیاء کرام گناہوں کے ارتکاب سے محفوظ اور معصوم ہوتے ہیں اور وہ نبوت سے پہلے اور نبوت کے بعد کسی بھی دور میں گناہوں کا ارتکاب نہیں کرتے باوجودیکہ ان میں گناہوں کے ارتکاب کی قدرت اور صلاحیت ہوتی ہے ۔

یہ گناہ کبائر میں سے ہوں جن میں کفر و شرک بھی آتے ہیں یا ان کا تعلق صغائر یعنی چھوٹے چھوٹے گناہوں سے ہو ۔ نیز گھٹیا حرکتوں ، فحش گفتگو اور بے مقصد اور فضول باتوں اور کاموں سے انبیاء کرام ہمیشہ دور رہتے ہیں اور ان کے قریب بھی نہیں جاتے ۔

انبیائے کرام سے البتہ بتقاضائے بشریت دنیاوی معاملات میں بھول چوک سر زد ہو جاتی ہے ۔ یعنی انبیائے کرام بعض اوقات اپنی رائے پر عمل کرتے ہوئے کسی بہتر اور افضل عمل پر کسی کمتر اور مفضول عمل کو ترجیح دے دیتے ہیں ۔ چونکہ یہ چیز بھی اللہ کی نظر میں ان کے شایانِ شان نہیں ہوتی ، لہٰذا اللہ تعالیٰ کی طرف سے بروقت تنبیہ ہوتی ہے جس پر وہ سنبھل جاتے ہیں اور اللہ تعالیٰ کی طرف توبہ

استغفار کے ساتھ رجوع کرتے ہیں جس سے ان کے درجات میں مزید اضافہ ہو جاتا ہے ۔

جہاں تک وحی اور رسالت سے متعلق امور کا تعلق ہے تو ان میں وہ بھول چوک سے بھی محفوظ ہوتے ہیں ۔

محمد صلی اللہ علیہ وسلم

(۱۹) وَمُحَمَّدٌ عَلَيْهِ الصَّلاَةُ وَالسَّلاَمُ حَبِيْبُهُ وَعَبْدُهُ وَرَسُوْلُهُ وَصَفِيُّهُ وَنَقِيُّهُ ۔ وَلَمْ يَعْبُدِ الصَّنَمَ وَلَمْ يُشْرِكْ بِاللّٰهِ تَعَالٰى طَرْفَةَ عَيْنٍ قَطُّ وَلَمْ يَرْتَكِبْ صَغِيْرَةً وَلاَ كَبِيْرَةً قَطُّ ۔

(۱۹) محمد صلی اللہ علیہ وسلم اللہ تعالی کے محبوب ،اس کے بندے اور رسول و نبی اور اس کے چنے ہوئے اور منتخب کردہ (ہستی) ہیں آپ نے کبھی پلک جھپکنے کے برابر لمحہ کے لیے بھی نہ تو کسی بت کی پرستش کی ہے اور نہ ہی اللہ تعالی کے ساتھ کسی کو شریک ٹھہرایا ہے ۔ آپ نے کبھی بھی کسی چھوٹے یا بڑے گناہ کا ارتکاب نہیں کیا۔

محمد صلی اللہ علیہ وسلم اللہ کے محبوب ترین بندے اور منتخب رسول ہیں۔ آپ نے اپنی زندگی میں کبھی گناہ کا کوئی کام نہیں کیا ۔آپ کی زندگی تمام مسلمانوں کے لیے اسوۂ حسنہ ہے ۔ آپ اللہ تعالی کی طرف سے انسانوں کی رہنمائی اور ہدایت کے لیے بھیجے گئے ،انبیاء و رسل کے سلسلے کی آخری کڑی ہیں۔ آپ کے بعد کوئی نبی نہ اب تک آیا ہے اور نہ قیامت تک آئے گا ۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو اپنے جملہ صفاتی ناموں میں اللہ کا عبدیعنی بندہ ہونا سب سے زیادہ پسند تھا ۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے مبالغہ آمیز عقیدت رکھنے اور محبت واحترام میں غلو سے کام لینے سے سختی سے منع فرمایا ہے ۔لہذا آپ کو خدائی

اختیارات تفویض کرنا،عالم الغیب قرار دینا، خدا کی طرح ہر جگہ حاضر وناظر تسلیم کرنا وغیرہ ،آپ سے محبت کا اظہار نہیں بلکہ آپ کے واضح احکام کی کھلم کھلا نا فرمانی اور قرآنی آیات کے انکار کے مترادف ہے جن میں نہایت ہی صراحت کے ساتھ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات سے ان چیزوں کی نفی کی گئی۔

خلفائے راشدین اور صحابہ کرام

(٢٠) وَاَفْضَلُ النَّاسِ بَعْدَ النَّبِيِّيْنَ عَلَيْهِمُ الصَّلٰوةُ وَالسَّلَامُ اَبُوْبَكْرِ الصِّدِّيْقِ ثُمَّ عُمَرُ بْنُ الْخَطَّابِ الْفَارُوْقُ ثُمَّ عُثْمَانُ بْنُ عَفَّانَ ذُوالنُّوْرَيْنِ ثُمَّ عَلِيُّ بْنُ اَبِيْ طَالِبٍ الْمُرْتَضٰى رِضْوَانُ اللّٰهِ تَعَالٰى عَلَيْهِمْ اَجْمَعِيْنَ . عَابِدِيْنَ ثَابِتِيْنَ عَلَى الْحَقِّ نَتَوَلَّاهُمْ جَمِيْعًا وَلَا نَذْكُرُ اَحَدًا مِنْ اَصْحَابِ رَسُوْلِ اللّٰهِ اِلَّا بِخَيْرٍ .

---

(٢٠) انبیاء علیہم الصلوٰۃ والسلام کے بعد تمام لوگوں میں سب سے افضل ترین ہستی حضرت ابو بکر صدیق رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی ہے ،پھر حضرت عمر بن الخطاب الفاروق رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی ،پھر حضرت عثمان بن عفان ذوالنورین رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی اور پھر حضرت علی بن ابی طالب المرتضیٰ رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی ہے۔ اللہ تعالیٰ کے عبادت گزار اور حق پر ثابت قدم رہنے والے ان حضرات نے ہمیشہ حق کا ساتھ دیا۔ ہمیں ان سب سے محبت ہے اور ہم رسول اللہ ﷺ کے صحابہ کرام میں سے کسی ایک بھی صحابی کو ماسوائے اچھے الفاظ ہر گز یاد نہیں کرتے۔

انبیاء کرام کے بعد بلا شک و شبہ افضل ترین فرد ابوبکر صدیقؓ ہیں جو بالغ مردوں میں سے نبی کریم ﷺ پر سب سے پہلے ایمان لائے تھے اور اپنے ایمان کی

طرح واقعہ معراج کو تسلیم کرنے میں بھی انہوں نے کسی ہچکچاہٹ کا مظاہرہ نہیں کیا جس کے سبب بارگاہ نبوی سے آپؓ کو الصدیق کا لقب ملا۔ قرآن مجید نے آپؓ کے صحابی ہونے کی گواہی دی۔ آپؓ کو رسول اللہ ﷺ کا رفیق غار، ہجرت کا ساتھی اور خلیفۃ الرسول ﷺ ہونے کا شرف حاصل ہے۔

ابوبکر صدیقؓ کے بعد عمر بن الخطابؓ کا مقام و مرتبہ ہے جنہیں رسول اللہ ﷺ نے فاروق کا لقب دیا تھا۔ عمرؓ کے اسلام لانے اور ان کے ذریعے اسلام کو طاقتور بنانے کی دعا خود رسول اللہ ﷺ نے کی تھی اور اس طرح آپؓ کو مراد رسول ہونے کا شرف حاصل ہے۔ کتب صحاح میں رسول اللہ ﷺ سے آپؓ کی فضیلت میں متعدد صحیح احادیث مروی ہیں۔ آپ کو ابوبکر صدیقؓ کی طرح نبی کریم ﷺ کا سسر ہونے کا اعزاز حاصل ہے۔

عمر الفاروقؓ کے بعد عثمان بن عفانؓ کا مقام و مرتبہ ہے جو تیسرے خلیفہ راشد ہیں۔ آپ کو تمام صحابہ کرام میں یہ شرف حاصل ہے کہ آپ کے عقد نکاح میں رسول اللہ ﷺ کی دو بیٹیاں یکے بعد دیگرے آئیں جس کی وجہ سے آپ کو ذوالنورین بننے کا اعزاز ملا۔ آپ نے جس طرح قدم قدم پر رسول اللہ ﷺ اور مسلمانوں کی اپنے مال و دولت سے مدد کی اس کا اعتراف نبی کریم ﷺ نے آپؓ کو جنت کی بشارت دے کر کیا تھا۔

عثمان ذوالنورین کے بعد نبی کریم ﷺ کے چچازاد بھائی اور آپؐ کی لخت جگر حضرت فاطمہ الزہراءؓ کے شوہر علی بن ابی طالبؓ کا مقام و مرتبہ ہے، جو چوتھے خلیفہ راشد ہیں۔ آپ کی فضیلت میں رسول اللہ ﷺ سے متعدد احادیث صحیح مروی ہیں جن میں نبی کریم ﷺ نے اپنے ساتھ آپؓ کے تعلق کو موسیٰ علیہ السلام کے ساتھ ہارون علیہ السلام کے تعلق کی مانند قرار دیا تھا اس فرق کے ساتھ کہ ہارونؑ نبی تھے مگر رسول اللہ ﷺ کے بعد کوئی نبی نہیں۔

ایک سچا مومن تمام صحابہ کرام سے محبت اور دوستی رکھتا ہے اور اپنی گفتگو اور تحریر و تقریر میں ان کے مقام و مرتبہ کو ملحوظ خاطر رکھتا ہے۔ کیونکہ کسی ایک صحابی سے بغض وعناد رکھنا ایمان کے خام ہونے کی دلیل ہے۔ نبی کریم ﷺ کا ارشاد ہے : میرے صحابہ سے محبت کرنے والا مومن، اور میرے صحابہ کے بارے میں اپنے دل میں بغض اور کینہ رکھنے والا منافق ہے۔

ارتکاب کبائر

(٢١) وَلاَ نُكَفِّرُ مُسْلِمًا بِذَنْبٍ مِنَ الذُّنُوْبِ وَاِنْ كَانَتْ كَبِيْرَةً اِذَا لَمْ يَسْتَحِلَّهَا وَلاَ نُزِيْلُ عَنْهُ اسْمَ الْاِيْمَانِ وَنُسَمِّيْهِ مُؤْمِنًا حَقِيْقَةً وَيَجُوْزُ اَنْ يَكُوْنَ مُؤْمِنًا فَاسِقًا غَيْرَ كَافِرٍ۔

---

(٢١) ہم کسی گناہ کے ارتکاب کی وجہ سے ، خواہ وہ کتنا ہی بڑا گناہ کیوں نہ ہو کسی مسلمان کو کافر نہیں قرار دیتے، بشرطیکہ وہ اس گناہ کے جواز کا قائل نہ ہو۔ ہم ایسے شخص سے ایمان کو زائل نہیں سمجھتے بلکہ ہمارے نزدیک وہ فاسق مومن ہے لیکن کافر ہرگز نہیں ہے۔

مسلمان کسی کبیرہ گناہ کے ارتکاب سے دائرہ اسلام سے خارج نہیں ہو جاتا بشرطیکہ وہ اس کو جائز اور حلال نہ سمجھتا ہو۔ لہذا کسی فرض کا تارک فاسق ہو گا کافر نہیں ہو گا۔ لیکن اگر کوئی شخص کسی فرض کی فرضیت کا منکر ہو یا حرام شے کی حرمت کا انکار کرتا ہو تو وہ دائراہ اسلام سے خارج ہو جائے گا۔ معتزلہ کے برعکس ، جو کبیرہ گناہوں کے مرتکب کو فاسق قرار دے کر ایمان اور کفر کے درمیان معلق قرار دیتے ہیں ، تاوقتیکہ وہ توبہ نہ کر لے، اہل سنت کے نزدیک فاسق اپنے فسق کے باوجود مومن ہی رہے گا۔ گویا اسلام اور ایمان ایک ہی سکے کے دو روخ ہیں : ایمان اس کا وہ پہلو ہے جو حقیقی قدر وقیمت کو ظاہر کرتا ہے، جبکہ اسلام اس کا وہ پہلو ہے جو اس کے ظاہری قدرو قیمت کو متعین کرتا ہے۔

موزوں پر مسح اور تراویح

(۲۲) وَالْمَسْحُ عَلَى الْخُفَّيْنِ سُنَّةٌ وَالتَّرَاوِيْحُ فِيْ لَيَالِيْ شَهْرِ رَمَضَانَ سُنَّةٌ وَالصَّلَاةُ خَلْفَ كُلِّ بَرٍّ وَفَاجِرٍ مِنَ الْمُؤْمِنِيْنَ جَائِزَةٌ.

---

(۲۲) موزوں پر مسح سنت ہے اور رمضان المبارک کی راتوں میں تراویح سنت ہے اور ہر نیک وبد صاحب ایمان کے پیچھے نماز ہو جاتی ہے۔

موزوں پر مسح کرنے کا سنت ہونا 'احادیث صحیحہ' جن کی روایات حد تواتر کے قریب پہنچتی ہے، اور عملی تواتر سے ثابت ہے۔ لہٰذا اس کا انکار صحیح نہیں۔ طہارت کی حالت میں اگر موزے پہن لئے جائیں تو مقیم کے لئے ایک دن اور ایک رات تک وضو کرتے وقت انھیں اتارے بغیر ان پر مسح کر لینا کافی ہے جبکہ مسافر کے لئے یہ رعایت تین دن اور تین راتوں کے لئے ہے۔

نماز تراویح جو رمضان المبارک کی راتوں میں ادا کی جاتی ہے، بھی سنت صحیحہ سے ثابت ہے۔ کیونکہ قیام اللیل اور صوم النہار کی بہت فضیلت وارد ہوئی ہے۔ تراویح نمازوں کی خصوصیت یہ ہے کہ ان میں دو عظیم ترین عبادتیں یعنی نماز اور تلاوت و سماع قرآن کریم ایک ساتھ ادا کی جاتی ہیں اور تیسری خصوصیت اس عمل کا باجماعت ادا ہونا ہے۔

نماز کی امامت کا جہاں تک تعلق ہے تو اس سلسلے میں جیسا کہ احادیث صحیحہ سے ثابت ہے، سب سے زیادہ نماز کی امامت کا مستحق وہ شخص ہے جو لوگوں

میں سب سے زیادہ دینی مسائل کا عالم ہو، اس کے بعد جو سب سے بڑا قاری اور حافظ قرآن ہو، پھر جو سب سے بڑھ کر پرہیز گار ہو وغیرہ۔ تاہم نماز ہر نیک اور برے شخص کے پیچھے ہو جاتی ہے بشرطیکہ وہ صحیح العقیدہ ہو، کیونکہ کسی بدعتی کے پیچھے نماز درست نہیں ہوگی خواہ وہ بظاہر متقی اور پرہیزگار ہی کیوں نہ ہو، اس لیے کہ بدعت عین گمراہی کا نام ہے اور گمراہ شخص سے کسی رہنمائی کی توقع فضول ہے جبکہ نماز کی امامت بھی ایک طرح کی رہنمائی اور قیادت ہے۔

گناہ بحالت ایمان

(۲۳) وَلاَ نَقُوْلُ اِنَّ الْمُؤْمِنَ لاَ تَضُرُّهُ الذُّنُوبُ وَلاَ نَقُوْلُ اِنَّهُ لاَ يَدْخُلُ النَّارَ . وَلاَ نَقُوْلُ اِنَّهُ يُخَلَّدُ فِيْهَا وَاِنْ كَانَ فَاسِقًا بَعْدَ اَنْ يَّخْرُجَ مِنَ الدُّنْيَا مؤْمِنًا .

---

(۲۳) ہم یہ نہیں کہتے کے کہ مومن کو گناہ کچھ نقصان نہیں پہنچا سکتے اور ہم یہ بھی نہیں کہتے کہ وہ (جہنم کی) آگ میں داخل نہیں ہوگا لیکن ہم یہ بھی نہیں کہتے ہیں کہ وہ اس میں ہمیشہ رہے گا، چاہے وہ فاسق ہی کیوں نہ ہو بشرطیکہ اس دنیا سے وہ حالت ایمان میں رحلت کر گیا ہو۔

اگر کوئی شخص ایمان لانے کے بعد گناہوں کا مرتکب ہوتا ہے تو وہ اپنے گناہوں کی سزا پائے گا اور آگ میں داخل ہوگا الا یہ کہ اللہ تعالیٰ اپنی رحمت سے کام لیتے ہوئے اسے معاف کر دے۔ کیونکہ سوائے شرک کے اللہ تعالیٰ جس کے لیے چاہے اس کا ہر گناہ معاف کر سکتا ہے البتہ گناہ گار مومن کے سلسلہ میں ہمارا عقیدہ یہ ہے کہ اگر اس کی موت ایمان کی حالت میں واقع ہوئی ہو تو وہ ہمیشہ کے لیے جہنم کی آگ میں نہیں رہے گا۔ اپنے گناہوں کی سزا بھگتنے کے بعد یا جب اللہ چاہے وہ جہنم سے نکل کر جنت میں ضرور جائے گا۔ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے " الیه یصعد الکلم الطیب والعمل الصالح یرفعه" یعنی کلمہ طیبہ (ایمان) اللہ تعالیٰ کی طرف بلند ہوتا ہے اور نیک اعمال اسے بلند ہونے میں مدد دیتے ہیں۔ لہذا ایمان

کے ساتھ اگر نیک اعمال نہ ہوں یا اس پر گناہ کا بوجھ ہو تو جوں ہی یہ بوجھ جہنم کی آگ میں بھسم ہو کر ختم ہوگا، ایمان اپنی بلندیوں کی طرف صاحب ایمان کو ضرور لے جائے گا۔

خوف و رجاء

(۲٤) وَلاَ نَقُوْلُ اِنَّ حَسَنَاتِنَا مَقْبُوْلَةٌ وَسَيِّئَاتِنَا مَغْفُوْرَةٌ كَقَوْلِ الْمُرْجِئَةِ وَلٰكِنْ نَقُوْلُ مَنْ عَمِلَ حَسَنَةً بِجَمِيْعِ شَرَائِطِهَا خَالِيَةً عَنِ الْعُيُوْبِ الْمُفْسِدَةِ وَلَمْ يُبْطِلْهَا بِالْكُفْرِ وَالرِّدَّةِ وَالْاَخْلاَقِ السَّيِّئَةِ حَتّٰى خَرَجَ مِنَ الدُّنْيَا مُؤمِنًا فَاِنَّ اللّٰهَ تَعَالٰى لاَ يُضِيْعُهَا بَلْ يَقْبَلُهَا مِنْهُ وَيُثِيْبُهُ عَلَيْهَا .

---

(۲۴) ہم یہ دعویٰ نہیں کرتے کہ ہماری نیکیاں (بارگاہ رب العزت میں) مقبول ہیں اور ہماری برائیاں بخش دی گئی ہیں جیسا کہ مرجئہ کا عقیدہ ہے ۔ ہمارا عقیدہ یہ ہے کہ جس نے کوئی نیکی کا کام اس کے جملہ شرائط کے ساتھ اس طرح انجام دیا کہ اس نیک عمل کو خراب کر دینے والے عیوب سے پاک تھا اور پھر اس نے اس عمل کو کفر وارتداد اور برے اخلاق کی بناء پر برباد نہیں کیا یہاں تک کہ وہ اس دنیا سے ایمان کی حالت میں رخصت ہوا تو اللہ تعالیٰ اس کے اس عمل کو ہرگز ضائع نہیں کرے گا بلکہ اسے قبول فرما کر اسے اس کا اچھا بدلہ عطا فرمائے گا۔

اللہ تعالیٰ پر ایمان کی حالت خوف ورجاء اور امید وبیم کے درمیان والی ہونی چاہیے۔لیکن اللہ تعالیٰ کے خوف سے یہ ہرگز مراد نہیں کہ اللہ تعالیٰ کوئی

ڈراؤنی اور خوفناک چیز ہے،یا وہ ایک ظالم و جابر ہستی ہے جس کے ظلم سے ہم ہر وقت لرزہ براندام ہوں،بلکہ جس طرح آدمی اپنے کسی محبوب و محترم ہستی کی ناراضگی سے خوف زدہ رہتا ہے اسی طرح ہمیں اپنے رحیم وکریم رب کی ناراضگی سے خائف رہنا چاہیئے کیونکہ ہمارا رب ہمیں محبوب بھی ہے اور ہمارے لیے نہایت محترم بھی ہے۔ہم اس کی اطاعت وفرماں برداری میں جو بھی کام کریں ان پر ہمیں ہر گز اترانا نہیں چاہیئے بلکہ نیک کاموں کی قبولیت کی شرائط بھی ملحوظ رکھنی چاہئیں جن میں سے پہلی اور بنیادی شرط نیت کا صحیح ہونا ہے۔ دوسری شرط ریاکاری سے بچنا اور تیسری شرط اپنے نیکی کے کاموں پر غرور سے بچنا چاہیئے اور ان پر اترا کرانہیں برباد نہیں کرنا چاہیئے ۔وغیرہ وغیرہ۔

اسی طرح اللہ تعالیٰ سے امید کا رشتہ کسی وقت بھی منقطع نہیں کرنا چاہیئے، تاہم امیدور جاء کا یہ مطلب نہیں کہ اس کی رحمت ومغفرت کی امید میں ہم گناہ پر گناہ کیے چلے جائیں اور سمجھ بیٹھیں کہ ہمارے گناہ معاف ہو جائیں گے۔اللہ تعالیٰ نیکیوں کا بدلہ ضرور دے گا، یہ اس کا وعدہ ہے۔ اس کے علاوہ چھوٹی چھوٹی برائیوں کو چھوٹی چھوٹی نیکیاں خود بخود مٹاتی رہتی ہیں ۔اصل معاملہ کبائر کے ارتکاب سے بچانا چاہیئے ۔اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے : "وان تجتنبو اکبائر ما تنھون عنہ نکفر عنکم سیئاتکم " یعنی اگر تم ان کبیرہ گناہوں سے بچو جن سے تمہیں روکا گیا ہے تو ہم تمہارے چھوٹے چھوٹے گناہ مٹا دیں گے۔

فسق و فجور

(۲۵) وَمَا كَانَ مِنَ السَّيِّئَاتِ دُوْنَ الشِّرْكِ وَالْكُفْرِ وَلَمْ يَتُبْ عَنْهَا صَاحِبُهَا حَتّٰى مَاتَ مُؤْمِنًا فَإِنَّهُ فِيْ مَشِيْئَةِ اللّٰهِ تَعَالٰى إِنْ شَاءَ عَذَّبَهُ بِالنَّارِ وَإِنْ شَاءَ عَفَا عَنْهُ وَلَمْ يُعَذِّبْهُ بِالنَّارِ أَصْلًا .

---

(۲۵) شرک اور کفر سے کمتر درجہ کے جتنے بھی گناہ ہیں ان کا مرتکب اگر بغیر توبہ کے حالت ایمان میں مر جائے تو (ہمارا عقیدہ یہ ہے کہ) اللہ تعالیٰ اس کے بارے میں جو چاہے فیصلہ کرے گا۔ چاہے تو اسے (جہنم کی) آگ کے ذریعے عذاب دے اور اگر چاہے تو اسے معاف کر دے اور (جہنم کی) آگ کے عذاب سے اسے مکمل طور پر بچالے۔

شرک اور کفر کے سوا جو قابل معافی نہیں ہیں ہر طرح کا گناہ خواہ وہ کبائر میں سے کیوں نہ ہو معاف ہو سکتا ہے۔ جب تک آدمی مشرک اور کافر ہوتا ہے اس کے یہی دونوں گناہ تمام گناہوں پر بھاری ہوتے ہیں ۔لیکن ایمان لانے کے بعد آدمی شرک اور کفر کے گناہوں کے چنگل سے نکل آتا ہے۔ایمان کی حالت میں سب سے بڑا گناہ فسق ہے۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:" بئس الاثم الفسوق بعد الایمان " یعنی ایمان لانے کے بعد سب سے بڑا گناہ فسق ہے۔ اور فسق وفجور میں درج ذیل کبیرہ گناہ آتے ہیں : زنا ،چوری ، کسی کو نا حق قتل کرنا،جادو ، سود خوری ،جھوٹا الزام یا جھوٹی گواہی ، پاک دامن عورتوں پر زنا کی

تہمت لگانا،والدین کو ستانا اور میدان جنگ سے فرار ہو نا وغیرہ۔

اس کے علاوہ صغیرہ گناہوں میں خود کو اس طرح ملوث کرنا کہ دل سے ان کی خلش بھی ختم ہو جائے،بعض علماء نے اسے بھی کبیرہ گناہوں میں شمار کیا ہے۔

ریاکاری اور نیکیوں پر غرور

(۲۶) وَالرِّيَاءُ اِذَا وَقَعَ فِيْ عَمَلٍ مِنَ الْاَعْمَالِ فَاِنَّهٗ يُبْطِلُ اَجْرَهٗ وَكَذٰلِكَ الْعُجْبُ .

(۲۶) عمل کے ساتھ ریاکاری شامل ہو جائے تو وہ عمل برباد ہو جاتا ہے۔اسی طرح کسی عمل کے ساتھ غرورِ عمل بھی اس عمل کی بربادی کا سبب بن جاتا ہے۔

ریاکاری اور اپنی نیکیوں پر غرور دو ایسی چیزیں ہیں جو نہ صرف اعمال کو برباد کر کے رکھ دیتی ہیں بلکہ انہیں آخرت کا وبال بنا دیتی ہیں۔ریاکاری دراصل ایک طرح کا دھوکہ اور فریب ہے اور منافقت کی ایک بھیانک ترین شکل ہے۔ اس سے جہاں تک ممکن ہو بچنا چاہیے۔ البتہ اگر کسی کی نیت یہ ہو کہ وہ اپنے کسی نیک عمل سے دوسروں کو ترغیب دینا چاہتا ہے یا انہیں تعلیم و تربیت دینا چاہتا ہے تو یہ ریاکاری نہیں ہو گی ، تاہم دلوں کا حال اللہ تعالیٰ خوب جانتا ہے۔ وہی روزِ جزاء لوگوں کی نیتوں کے مطابق انہیں ان کے اعمال کا بدلہ دے گا۔ اسی طرح اپنے اعمال پر غرور بھی انسان کے لیے باعث تباہی اور بربادی ہے ، خود کو اپنے اچھے اور نیک کاموں کی وجہ سے دوسروں سے برتر اور ممتاز جاننا اور دوسروں کو ان اعمال میں کوتاہی کی وجہ سے حقیر سمجھنا اور اس بنا پر ان سے رخ پھیرنا اور سیدھے منہ بات نہ کرنا یا سرے سے انہیں دائرہ اسلام سے خارج جاننا وغیرہ اللہ تعالیٰ کو کسی طور بھی پسند نہیں۔ اس سے ہر صاحبِ بصیرت اور صاحبِ فہم و فراست شخص کو بچنا چاہیے۔

معجزات و کرامات

(۲۷) وَالْاٰيَاتُ ثَابِتَةٌ لِلْاَنْبِيَاءِ وَالْكَرَامَاتُ لِلْاَوْلِيَاءِ حَقٌّ . وَاَمَّا الَّتِيْ تَكُوْنُ لِاَعْدَائِهٖ مِثْلَ اِبْلِيْسَ وَفِرْعَوْنَ وَالدَّجَّالِ فَمَا رُوِيَ فِي الْاَخْبَارِ اَنَّهٗ كَانَ وَيَكُوْنُ لَهُمْ لَا نُسَمِّيْهَا آيَاتٍ وَلَا كَرَامَاتٍ وَلٰكِنْ نُسَمِّيْهَا قَضَاءَ حَاجَاتِهِمْ وَذٰلِكَ لِاَنَّ اللّٰهَ تَعَالٰى يَقْضِيْ حَاجَاتِ اَعْدَائِهٖ اِسْتِدْرَاجًا لَهُمْ وَعُقُوْبَةً لَهُمْ فَيَغْتَرُّوْنَ بِهٖ وَيَزْدَادُوْنَ طُغْيَانًا وَكُفْرًا وَذٰلِكَ كُلُّهٗ جَائِزٌ مُمْكِنٌ .

(۲۷) انبیاء کرام کے معجزات مسلم الثبوت ہیں اور اولیاء کرام کے کرامات حق ہیں۔ البتہ احادیث صحیحہ کے مطابق وہ (خرق عادت) کارنامے جو ابلیس، فرعون اور دجال جیسے دشمنان خدا کے ہاتھوں سر زد ہوئے یا ہوں گے ،ہم انہیں معجزات یا کرامات میں شمار نہیں کرتے بلکہ ہم انہیں ان کی آرزوں کی تکمیل کا نام دیتے ہیں۔ کیونکہ اللہ تعالیٰ اپنے دشمنوں کو ڈھیل دے کر عذاب کا مستحق ٹھہرانے کے لیے ان کی آرزوئیں پوری کرتا ہے تاکہ اسی دھوکے میں رہیں اور مزید کفر و سرکشی میں گرفتار ہوں، یہ سب کچھ درست اور ممکن الوقوع ہے۔

انبیاء کرام سے جو افعال مافوق الفطرت طریقے سے خرق عادت کے طور

پر یعنی طبعی اصول کے برعکس ثابت ہوتے ہیں انہیں معجزہ کہا جاتا ہے۔یعنی ایسا کام کرنے سے عام لوگ عاجز ہوں اور وہ ان کے بس کی بات نہ ہو۔مثلا موسیٰ علیہ السلام کا عصا اور ید بیضاء ، عیسیٰ علیہ السلام کا مردوں کو زندہ کرنا اور پیدائشی اندھے اور کوڑھی کو تندرست کر دینا اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی انگلیوں سے پانی کا فوارہ کی طرح سے پھوٹ کر نکلنا وغیرہ ۔ ان معجزات کا مقصد لوگوں پر اتمام حجت اور انبیاء کرام کی حقانیت اور سچائی کا اظہار ہوتا ہے ۔

اسی طرح اولیائے کرام کے ہاتھ پر طبعی اصول کے برعکس جو خرق عادت افعال سر زد ہوتے ہیں انہیں کرامات کہا جاتا ہے ۔ اس لیے کہ ان کے ذریعے اللہ تعالیٰ ان کے اکرام و اعزاز میں اضافہ کرنا چاہتا تھا ۔ تاہم معجزات اور کرامات کو صادر کرنے پر از خود قادر نہیں ہوتے اور وہ اپنے اختیار سے ایسا نہیں کرتے ۔ اللہ تعالیٰ جب چاہتا ہے اپنے ان منتخب بندوں کے ہاتھ پر اس طرح کے افعال صادر کرا دیتا ہے۔ نیز ان افعال کا صدور اگرچہ ان پاکباز شخصیات کے ہاتھ پر ہو رہا ہوتا ہے ، مگر ان کا خالق خود ذاتِ باری تعالیٰ ہوتا ہے ۔ جیسا کہ ارشادِ باری تعالیٰ ہے : "وما رمیت اذ رمیت ولکن اللہ رمی". یعنی (حقیقت میں) آپ نے نہیں پھینکا تھا ، جب آپ نے (ان کنکریوں کو) پھینکا تھا ، بلکہ (انہیں)اللہ نے ہی پھینکا تھا ۔

جہاں تک کافروں اور غیر مسلموں کے ہاتھ پر خرق عادت اور غیر معمولی افعال کے صادر ہونے کا تعلق ہے ، تو وہ نہ از قسم معجزات ہوتے ہیں اور نہ ہی کرامات بلکہ وہ یا تو شعبدہ بازی اور جادو کے کرشمے ہوتے ہیں جو محض فریب نظر پر مبنی ہوتے ہیں یا پھر وہ حقیقی افعال ہوں بھی تو وہ ان کی گمراہی کو مزید پکا کرنے ، انہیں ڈھیل اور مہلت دینے اور انہیں مزید آزمائش سے دوچار کرنے کی غرض سے اللہ تعالیٰ ان سے سرزد کراتا ہے ۔

خلاقیت و رزاقیت باری تعالیٰ

(۲۸) وَكَانَ اللّٰهُ تَعَالىٰ خَالِقًا قَبْلَ اَنْ يَّخْلُقَ وَرَازِقًا قَبْلَ اَنْ يَّرْزُقَ .

(۲۸) اللہ تعالیٰ عملِ تخلیق شروع کرنے سے پہلے بھی صفتِ خلق سے متصف تھے اور مخلوقات کی ضروریات پوری کرنے سے پہلے بھی صفتِ رزاقیت سے پوری طرح متصف تھے ۔

یہ مسئلہ ابتداء میں گزر چکا ہے اور یہاں پر دوبارہ تاکید کی غرض سے ذکر کیا گیا ہے۔ اللہ تعالیٰ کے فعلی صفات کیسے مخلوقات کی تخلیق ہے ، انہیں رزق عطا کرنا ، ان پر رحم کھانا ہے ، وغیرہ وغیرہ ؛ کے دو پہلو ہیں : ایک ان افعال کا اللہ تعالیٰ کی ذات سے صادر ہونا اور دوسرے ان افعال کا اس کی مخلوقات پر وارد اور واقع ہونا ۔ اللہ تعالیٰ کی نسبت سے ان افعال کے صدور اور ظہور کے درمیان وقت کے طویل پیمانوں کی چونکہ کوئی اہمیت نہیں ہے ، لہٰذا اللہ تعالیٰ کی ان صفات کے ازلی ہونے پر وقت کے ان پیمانوں سے کوئی فرق نہیں پڑتا ۔ اس طرح اللہ تعالیٰ ازل سے خالق ، رازق ، مالک اور معبود چلا آرہا ہے ، جبکہ ابھی زمین و آسمان اور دیگر مخلوقات کا سرے سے وجود ہی نہیں تھا اور اس وقت بھی وہ اپنی صفات کے ساتھ قائم و دائم رہے گا جب رب ذوالجلال والاکرام کی ذات کے سوا اس کی ساری مخلوقات فنا ہو جائیں گی ۔

رؤیت باری تعالیٰ

(۲۹) وَاللّٰهُ تَعَالٰى يُرٰى فِى الْآخِرَةِ وَيَرَاهُ الْمُؤْمِنُوْنَ وَهُمْ فِى الْجَنَّةِ بِاَعْيُنِ رُؤُسِهِمْ بِلاَ تَشْبِيْهٍ وَلاَ كَيْفِيَةٍ وَلاَ يَكُوْنُ بَيْنَهُ وَبَيْنَ خَلْقِهٖ مَسَافَةٌ.

---

(۲۹) آخرت میں اللہ تعالیٰ کا دیدار ہو گا اور مؤمنین جنت میں اپنے سروں کی آنکھوں سے اللہ تعالیٰ کو دیکھیں گے۔ لیکن یہ رؤیت باری تعالیٰ اس طرح ہو گی کہ ذاتِ عزوجل تشبیہ اور جسم کی خامیوں سے پاک ہو گی۔ نیز خالق اور اس کی مخلوق کے درمیان کسی قسم کی دوری اور مسافت (حائل) نہ ہو گی۔

آخرت میں تمام مؤمنین اپنی آنکھوں سے اپنے رب کو دیکھیں اور اس کی زیارت سے مشرف ہوں گے۔ اللہ تعالیٰ چونکہ غیر مادی اور نورانی ہستی ہے جو جسم اور جسم کی جملہ خامیوں سے پاک ہے لہٰذا اس دنیا کے طبعی قوانین کے تحت ہمارے تصور میں اللہ تعالیٰ کی رؤیت کی کیفیت نہیں آسکتی۔ نیز اللہ تعالیٰ کی ذات چونکہ جہات اور حدود سے بھی ماوراء ہے لہٰذا ہمارے لیے یہ بات الجھن کا باعث بنتی ہے کہ ایک ایسی ہستی کو جو خاص جہت اور سمت میں محدود نہیں، دیکھنا کس طرح ممکن ہو گا۔ لیکن اگر چند ایک امور کو ملحوظ خاطر رکھا جائے تو اس الجھن کا دور ہونا کچھ مشکل نہیں۔

اول : اس دنیا کے مقابلے میں مؤمنین کی حیات اور قویٰ آخرت میں کہیں زیادہ قوی اور طاقتور ہوں گے جن میں ان کے دیکھنے کی صلاحیت بھی ہے۔ اس دنیا میں تو اللہ تعالٰی کے نور کی ایک ادنیٰ سی جھلک نے پہاڑ کو ریزہ ریزہ کر دیا تھا اور موسیٰ علیہ السلام بے ہوش ہو کر گر پڑے تھے ، تاہم آخرت میں مؤمنین کی نظر دنیا کے مقابلے میں کہیں زیادہ طاقتور ہو گی ۔

دوم : اللہ تعالٰی اپنے جلوہ کو اس سطح پر رکھیں گے جس میں مؤمنین کو رؤیت باری میں کوئی دشواری نہ ہو ۔ جس طرح ہم روشنی کی شدت کو کسی سوئچ اور نوب کے ذریعہ گھٹا یا بڑھا سکتے ہیں ، حالانکہ روشنی کی طاقت وہی رہتی ہے ۔ اسی طرح اللہ تعالٰی کے نور میں تو کمی بیشی ممکن ہی نہیں ، تاہم دیکھنے والوں کے لیے اسے اس سطح پر لانا جہاں ان کی نظریں ان کی تاب لا سکیں ، ممکن ہے ۔

سوم : یاد رکھنا چاہیے کہ جب ہم کسی چیز کو دیکھتے ہیں تو ہم محض اس کا ایک حصہ ہی دیکھ کر کہہ دیتے ہیں کہ ہم نے اس کو دیکھا ہے ۔ مثلاً ہم بے کراں آسمان کا ایک حصہ دیکھ کر آسمان کو دیکھنے کا دعویٰ کرتے ہیں ، حالانکہ آسمان ہمارے حساب سے لا محدود ہے ۔ اسی طرح ہم کسی آدمی کا چہرہ دیکھ کر اسے اس کی زیارت اور ملاقات سے تعبیر کرتے ہیں ، حالانکہ اس کا باقی سارا جسم لباس میں مستور ہوتا ہے ۔ سو اللہ تعالٰی کے جلوہ کو دیکھنے کی نوعیت بھی اسی طرح کی ہو گی ۔

چہارم : یہ بات بھی ملحوظِ خاطر رہے کہ سمت اور جہات یا فاصلہ وغیرہ کا تصور درست نہیں ہیں ۔ جب روشنی ہوتی ہے تو ہر چیز کا احاطہ کر لیتی ہے اور جب ہر طرف نور ہی نور ہو اور اندھیرے کا نام و نشان ہی نہ ہو تو پھر سمت اور فاصلے وغیرہ اپنی معنویت کھو دیتے ہیں ۔ رہا اندھیرا تو وہ آخرت میں مشرکین اور کافروں کا مقدر ہو گا ۔

ایمان میں کمی بیشی

(۳۰) وَالْاِیْمَانُ هُوَ الْاِقْرَارُ وَالتَّصْدِیْقُ . وَاِیْمَانُ اَهْلِ السَّمَاءِ وَالْاَرْضِ لاَ یَزِیْدُ وَلاَ یَنْقُصُ مِنْ جِهَةِ الْمُؤمِنِ بِهٖ وَیَزِیْدُ وَیَنْقُصُ مِنْ جِهَةِ الْیَقِیْنِ وَالتَّصْدِیْقِ . وَالْمُؤمِنُوْنَ مُسْتَوُوْنَ فِی الْاِیْمَانِ وَالتَّوْحِیْدِ مُتَفَاضِلُوْنَ فِی الْاَعْمَالِ .

---

(۳۰) ایمان نام ہے (زبان سے) اقرار اور (دل سے) تصدیق کا ۔ زمین و آسمان میں رہنے والوں کا ایمان ، ان امور کے اعتبار سے جن پر ایمان لانے سے کوئی شخص مؤمن بنتا ہے ، کم و بیش نہیں ہوتا ۔ البتہ (درجات) یقین و تصدیق کے لحاظ سے ایمان میں کمی بیشی ہوتی ہے ۔ تمام مؤمنین ایمان اور توحید کے سلسلے میں تو برابر ہوتے ہیں البتہ اعمال کے اعتبار سے ایک دوسرے پر برتری کے حامل ہوتے ہیں ۔

جیسا کہ پہلے گزر چکا ہے ، ایمان کے لیے صدقِ دل سے تصدیق اور زبان سے بلا جبر و اکراہ اور لالچ کے اقرار ضروری ہے ۔ کسی ایک چیز کی کمی سے وہ ایمان نہیں کہلائے گا ۔ محض زبانی اقرار سے منافقت یا دکھاوا اور ظاہر داری کہلائے گا اور محض دل سے ماننے اور زبان سے اقرار و تسلیم سے انکار کی صورت میں وہ ایک خیال اور سوچ کی حیثیت سے آگے نہیں بڑھے گا ۔ کیونکہ ایمان کے اظہار کے لیے

ضروری ہے کہ اعضاء و جوارح اپنے عمل سے اس کی گواہی دیں ۔ اور زبان بھی ایک عضو ہے اور زبان کا عمل اس کا بولنا ہے ، لہٰذا کم از کم زبان سے اقرار ضروری ہے جو عمل کا سب سے ادنیٰ درجہ ہے ۔

ایمان دراصل ایک وحدت کا نام ہے جس میں کمی بیشی نہیں ہو سکتی ، یہ نہیں کہا جا سکتا کہ فلاں کا ایمان دوگنا ہے یا فلاں کا چارگنا اور فلاں کا سوگنا وغیرہ ، یا فلاں شخص کا ایمان آدھا ہے یا فلاں کا ایک تہائی یا ایک چوتھائی وغیرہ ۔ گویا مقدار کے اعتبار سے سب کا ایمان ایک ہی جتنا ہوتا ہے البتہ کیفیت کے اعتبار سے ایمان کے درجات متفاوت ہوتے ہیں ۔ کسی کا ایمان خام نوعیت کا ہو سکتا ہے ، کسی کا متوسط درجے کا اور کسی کا نہایت ہی صاف و شفاف اور اعلیٰ درجے کا ۔ انبیاء کرام کا ایمان سب سے اعلیٰ درجے کا ہوتا ہے کیونکہ وہ حق الیقین کے درجے پر فائز ہوتے ہیں ۔ صدیقین اور شہداء کا ایمان عین الیقین کے درجے کا ہوتا ہے ، جبکہ صحابہ صلحاء اور عامۃ الناس کا ایمان علم الیقین کے درجے کا ہوتا ہے ۔ نیز ان تینوں درجات میں پھر متعدد مراتب ہو سکتے ہیں ۔

البتہ اعمال کے اعتبار سے درجات بھی مختلف ہوتے ہیں اور اعمال میں کمی بیشی ہونے کی وجہ سے مقدار کے اعتبار سے بھی کسی کے اعمال زیادہ ہو سکتے ہیں اور کسی کے کم ،نیز اعمال کا درجہ کمی یا بیشی کے علاوہ ان میں خلوص ، تقویٰ اور انکساری کی بنیاد پر متعین ہوتا ہے ۔انبیاء کرام ایمان اور اعمال دونوں کے اعتبار سے بلند ترین مرتبے پر فائز ہوتے ہیں جبکہ دیگر لوگوں میں یہ امکان ہوتا ہے کہ کوئی شخص ایمان کے اعتبار سے تو شہداء کے مرتبے پر فائز ہو ، یعنی اسے عین الیقین حاصل ہو ، جبکہ اعمال کے اعتبار سے اس کے پاس بہت ہی تھوڑا سرمایہ ہو ، جیسا کہ ایک غزوہ کے موقعہ پر ایک شخص نے نبی کریم ﷺ کی خدمت میں آکر اسلام قبول کیا اور کفار سے جہاد کرتے ہوئے شہید ہو گیا ۔ اس طرح اس نے نہ تو کوئی

نماز پڑھی اور نہ کوئی روزہ رکھا اور نہ ہی کوئی نیک عمل کیا، ماسوائے شہادت کے، اور یوں وہ شہادت کا درجہ پا کر بلند مقامات کا مستحق بن گیا۔ چونکہ شہید اپنی جان کا نذرانہ دے کر اپنے ایمان کی گواہی دیتا ہے، لہٰذا ایمان کے عین الیقین والے مرتبے پر فائز ہوتا ہے خواہ اس کے اعمال مقدار کے اعتبار سے تھوڑے ہی کیوں نہ ہوں۔

ایمان اور اسلام

(۳۱) وَالْإِسْلَامُ هُوَ التَّسْلِيْمُ وَالْاِنْقِيَادُ لِاَوَامِرِ اللّٰهِ تَعَالٰی . فَمِنْ طَرِيْقِ اللُّغَةِ فَرْقٌ بَيْنَ الْاِيْمَانِ وَالْاِسْلَامِ . وَلٰكِنْ لَا يَكُوْنُ اِيْمَانٌ بِلَا اِسْلَامٍ وَلَا يُوْجَدُ اِسْلَامٌ بِلَا اِيْمَانٍ وَهُمَا كَالظَّهْرِ مَعَ الْبَطْنِ وَالدِّيْنُ اسْمٌ وَاقِعٌ عَلَى الْاِيْمَانِ وَالْاِسْلَامِ وَالشَّرَائِعِ كُلِّهَا .

(۳۱) اسلام اللہ تعالیٰ کے احکام کو تسلیم کرنے اور ان کی اطاعت کا نام ہے۔ اگر چہ لغوی اعتبار سے ایمان اور اسلام میں فرق ہے، لیکن اسلام کے بغیر ایمان (کا تصور ممکن) نہیں۔ گویا دونوں ایک ہی شے کا سیدھا اور الٹا رخ ہیں۔ جبکہ دین نام ہے ایمان، اسلام اور تمام شرعی احکامات کے مجموعے کا۔

اسلام کا لفظ س ل م کے مادہ سے بنا ہے جس کے دو معنی ہیں: (۱) تسلیم و اطاعت اور (۲) سلامتی اور تحفظ۔ اسلام کا لفظ ان دو معنوں پر مشتمل ہے۔ یعنی اللہ تعالیٰ کے احکام کو تسلیم کر کے اپنی زندگی اس کی اطاعت میں بسر کرنا اور یوں دنیا وآخرت میں اپنی سلامتی اور تحفظ کو یقینی بنا لینا۔

لغوی اعتبار سے اگرچہ اسلام اور ایمان میں فرق ہے مگر اپنے اصطلاحی معنی میں ان میں کوئی فرق نہیں ہے۔ کیونکہ یہ ممکن نہیں کو کوئی شخص اپنے صاحب ایمان ہونے کا اقرار تو کرے مگر اللہ تعالیٰ کے احکام کو تسلیم کرنے اور اس کی

اطاعت کرنے پر تیار نہ ہو، اور اس کے باوجود اسے مومن تسلیم کیا جا سکے۔ اسی طرح یہ بھی خارج از مکان ہے کہ کوئی شخص اللہ تعالی کے احکام کو تسلیم کر کے اپنی زندگی اس کے مطابق گزار دے جبکہ وہ ان احکام پر صدق دل سے یقین ہی نہ رکھتا ہو۔ اس لیے اسلام اور ایمان ایک ہی سکے کے دو رخ ہیں جس کا اگر ایک رخ گھسا کر اس کے نقوش مٹا دیے جائیں تو وہ سکہ کھوٹا ہو جاتا ہے۔

جہاں تک دین کا تعلق ہے تو وہ عقائد، عبادات، احکام اور اخلاقیات حتی کہ زندگی گزارنے کے ہر انداز اور طور طریقے کے لیے ایک جامع لفظ ہے۔

معرفت اور عبادت باری تعالی

(۳۲) نَعْرِفُ اللّٰهَ تَعَالىٰ حَقَّ مَعْرِفَتِهٖ كَمَا وَصَفَ اللّٰهُ نَفْسَهٗ فِيْ كِتَابِهٖ بِجَمِيْعِ صِفَاتِه وَلَيْسَ يَقْدِرُ اَحَدٌ اَنْ يَعْبُدَ اللّٰهَ تَعَالىٰ حَقَّ عِبَادَتِهٖ كَمَاْ هُوَ اَهْلٌ لَهٗ وَلٰكِنَّهٗ يَعْبُدُهٗ بِاَمْرِهٖ كَمَا اَمَرَهٗ بِكِتَابِه وَسُنَّةِ رَسُوْلِهٖ .

---

(۳۲) اللہ تعالی نے اپنی کتاب میں خود اپنے بارے میں اور اپنی صفات کے سلسلے میں جو کچھ بیان کیا ہے اس سے ہم اللہ تعالی کی مکمل اور صحیح معرفت حاصل کرتے اور اسے پوری طرح جان لیتے ہیں۔ مگر کوئی بھی شخص اللہ تعالی کی اس طرح ٹھیک طریقے سے عبادت نہیں کر سکتا جس طرح کی عبادت کا وہ حقدار ہے۔ البتہ اس کے حکم کی تعمیل میں وہ اس کی عبادت کرتا ہے جیسا کہ اس نے اپنی کتاب اور سنت رسول کے ذریعے اس کی تعلیم دی ہے۔

اللہ تعالی کی ذات کی حقیقت کا ادراک ہمارے لیے ممکن نہیں تاہم اس کی صفات کے ذریعے ہم اس کی ذات کے بارے میں بہت کچھ جانتے ہیں۔ کیونکہ اس کی جملہ صفات اس کی ذات سے الگ نہیں، اس کا مظہر ہیں۔ اس طرح اپنے رب کی پہچان اور معرفت کے لیے جتنا کچھ ہمیں جاننا چاہیے تھا وہ ہم جان چکے ہیں اور اس سے زیادہ جاننے کا ہم مکلف بھی نہیں ہیں۔ البتہ جہاں تک اس کی عبادت کا

تعلق ہے تو ہم اپنی تمام کوشش کے باوجود کماحقہٗ اس کی عبادت نہیں کرسکتے۔ لیکن اگر ہم اس کے احکام جو قرآن اور سنت رسول میں موجود ہیں ، پر عمل کرتے ہوئے اس کی عبادت کریں تو ہمیں امید رکھنی چاہیے کہ وہ انہیں شرف قبولیت و پذیرائی بخشے گا اور اس سلسلے میں ہماری کوتاہیوں کو نظر انداز کردے گا اور یوں ہمیں دنیا و آخرت میں اپنی بے پایاں عنایات سے محروم نہیں کرے گا۔

تمام مومنین کا ایمان یکساں ہے

(۳۳) وَيَسْتَوِى الْمُؤْمِنُوْنَ كُلُّهُمْ فِى الْمَعْرِفَةِ وَالْيَقِيْنِ وَالتَّوَكُّلِ وَالْمَحَبَّةِ وَالرِّضَاءِ وَالْخَوْفِ وَالرَّجَاءِ وَالْاِيْمَانِ فِىْ ذٰلِكَ . وَيَتَفَاوَتُوْنَ فِيْمَا دُوْنَ الْاِيْمَانِ فِىْ ذٰلِكَ كُلِّهٖ .

(۳۳) تمام مومنین اللہ تعالی کی پہچان ، اس پر یقین رکھنے، توکل کرنے، اس کی محبت اور رضامندی، اس سے ڈرنے اور پر امید ہونے (جیسے امور) پر ایمان رکھنے کے سلسلے میں برابر ہوتے ہیں، البتہ ان تمام امور میں ایمان کے سوا دیگر اعتبارات سے مختلف اور متفاوت درجات پر فائز ہوتے ہیں۔

یہ مسئلہ پہلے بھی گزر چکا ہے کہ اللہ تعالی سے بندوں کا جو تعلق ہے وہ ایمان کا ہو یا اس کی معرفت و یقین کا، اس پر توکل اور بھروسہ کا مسئلہ ہو یا اس سے محبت اور اس کی رضاجوئی کا۔ اس سے ڈرنے کا معاملہ ہو یا اس سے اپنی کسی امید کے پورے ہونے کا، ان تمام امور میں کمیت یعنی مقدار کے اعتبار سے تمام مسلمان برابر ہوتے ہیں، لیکن کیفیت کے اعتبار سے کسی کو اللہ کی معرفت اور اس پر یقین بلند درجے کا حاصل ہوتا ہے اور کسی کو کم، کسی کا اللہ پر توکل اور بھروسہ ٹھوس ہوتا ہے کسی کا خام، کسی کو اس سے محبت انتہاء درجے کی ہوتی ہے اور وہ اس کی رضا مندی کا طلب گار دیوانگی کی حد تک ہوتا ہے اور کسی کو معمول کے

مطابق یا اس سے بھی کم ، کوئی اس کے خوف سے لرزہ بر اندام رہتا ہے اور کوئی لا پرواہ، کسی کی امید بہت طاقت ور ہوتی ہے اور کسی کی کمزور۔ لہذا کیفیت کے اعتبار سے لوگ ان امور میں متفاوت درجات پر فائز ہوتے ہیں تا ہم کمیت کے اعتبار سے ان امور میں سے کوئی بھی چیز تقسیم اور تجزی یا کمی اور بیشی قبول نہیں کرتی۔ گویایا تو وہ چیز کسی میں موجود ہوگی یا سرے سے نہیں ہوگی، لہذا یا تو ایمان ہوگا یا نہیں ہوگا،یا اللہ پر بھروسہ ہوگا یا نہیں ہوگا ، یا اس سے محبت ہوگی یا نہیں ہوگی۔ یا تو اس کا خوف دل میں ہوگا یا نہیں ہوگا وغیرہ وغیرہ۔ اس سے ثابت ہوا کہ کمیت کے اعتبار سے لوگ ان امور میں متفاوت نہیں ہوتے جبکہ کیفیت کے اعتبار سے زمین وآسمان کا فرق ہو سکتا ہے۔

گناہوں کی سزا

(٣٤) وَاللّٰهُ تَعَالٰى مُتَفَضِّلٌ عَلٰى عِبَادِهٖ عَادِلٌ قَدْ يُعْطِي مِنَ الثَّوَابِ اَضْعَافَ مَا يَسْتَوْجِبُهُ الْعَبْدُ تَفَضُّلًا مِنْهُ وَقَدْ يُعَاقِبُ عَلَى الذَّنْبِ عَدْلًا مِنْهُ وَقَدْ يَعْفُوْ فَضْلًا مِنْهُ .

(۳۴) اللہ تعالیٰ اپنے بندوں کے حق میں عادل ہونے کے علاوہ ان پر فضل و عنایت کرنے والا بھی ہے۔ وہ کبھی بندے کو اس کے استحقاق سے کئی گنا زیادہ ثواب عطا کرتا ہے اور کبھی عدل کے تقاضوں کے تحت اسے اس کے گناہ کی سزا دیتا ہے اور کبھی اس کے جرم کو فضل و کرم کی بنا پر معاف بھی کر دیتا ہے۔

اللہ تعالیٰ اپنے بندوں کے معاملے میں بعض اوقات عدل سے کام لیتا ہے اور انہیں ان کے کیے کی پوری سزا دیتا ہے جبکہ زیادہ تر وہ اپنے فضل و کرم سے کام لیتے ہوئے ان سے نرمی اور بھلائی کا برتاؤ کرتا ہے۔ تا ہم عدل سے کم تر کا یعنی کسی بھی درجے کے ظلم اور ناانصافی کا اللہ تعالیٰ کے بارے میں تصور بھی نہیں کیا جا سکتا۔ اللہ تعالیٰ اپنے فضل و کرم کی وجہ سے ان کے استحقاق سے بڑھ کر بدلہ عطا کرتا ہے ۔ حتیٰ کہ وہ نیکیوں کو سات سو گنا تک بڑھا دیتا ہے جب کہ وہ گناہ کا بدلہ اتنا ہی دیتا ہے جتنا بڑا یا چھوٹا گناہ ہوتا ہے ۔ گناہ پر سزا دینا اس کے عدل کی وجہ سے ہوتا ہے تاہم وہ اپنے گناہ گار بندوں پر بھی اپنے فضل و کرم اور رحمت

کے دروازے بند نہیں کرتا اور ان گناہوں کو معاف کر دیتا ہے ۔ اس کی رحمت بے کراں ہے جس کا ثبوت اس کے اسمائے حسنیٰ ہیں۔ اس کے صفاتی ناموں میں سے زیادہ تر اسمائے حسنیٰ ایسے ہیں جن میں اس کی رحمت و مہربانی اور مخلوق کے حق میں خیر وبہتری کے بے شمار پہلو سموئے ہوئے ہیں جب کہ اس کی ناراضگی اور قہر و جبر کے حوالے سے اسمائے حسنیٰ آٹے میں نمک کے برابر ہیں۔ اس سے اندازہ لگایا جاسکتا ہے کہ وہ کس قدر بخشنے والا اور مہربان ہے۔

شفاعت انبیاءِ کرام

(۳۵) وَشَفَاعَةُ الْأَنْبِيَاءِ عَلَيْهِمُ السَّلَامُ حَقٌّ وَشَفَاعَةُ النَّبِيِّ عَلَيْهِ الصَّلَاةُ لِلْمُؤْمِنِيْنَ الْمُذْنِبِيْنَ وَلِأَهْلِ الْكَبَائِرِ مِنْهُمْ الْمُسْتَوْجِبِيْنَ الْعِقَابِ حَقٌّ ثَابِتٌ.

(۳۵) انبیاء علیہم السلام کی شفاعت حق ہے۔ نبی کریم ﷺ کی شفاعت گناہ گار مومنین اور بڑے بڑے گناہوں کا ارتکاب کر کے سزا کا مستحق بن جانے والوں کے لیے حق ہے اور ثابت شدہ ہے۔

انبیاء علیہم السلام کا اپنی اپنی امت کے لوگوں کے لیے اللہ تعالیٰ سے شفاعت کر کے ان کی سزائیں معاف کرانا قران و سنت سے ثابت شدہ ہے۔ نیز نبی آخرالزماں حضرت محمد ﷺ قیامت کے دن تمام انسانوں کی طرف سے رحم و کرم کی درخواست کریں گے اور آپ کی شفاعت سے لوگوں کو قیامت کی سختیوں سے نجات ملے گی اور حساب کتاب کا مرحلہ شروع ہو گا۔ اسی طرح نبی کریم ﷺ اپنی امت کے گناہ گاروں کی شفاعت کریں گے اور انہیں آپؐ کی شفاعت کی وجہ سے جہنم سے نکال کے جنت میں داخل کیا جائے گا۔ حتیٰ کہ آدم علیہ السلام سے لے کر قیامت تک جتنے بھی لوگ ہوں گے خواہ ان کا تعلق کسی بھی نبی کی امت سے ہو، اگر ان میں سے کسی کے دل میں رائی کے برابر بھی ایمان ہو گا تو رحمتہ للعالمین کی شفاعت پر رب لعالمین اسے جہنم سے نکال جنت میں داخل کر دے گا۔ یہ رب العالمین کا رحمتہ اللعالمین سے وعدہ ہے اور وہ اپنے وعدے کے خلاف کبھی نہیں کرتا۔

قیامت کا دن اور حساب و کتاب

(۳۶) وَوَزْنُ الْاَعْمَالِ بِالْمِيْزَانِ يَوْمَ الْقِيَامَةِ حَقٌّ وَحَوْضُ النَّبِيِّ عَلَيْهِ الصَّلاَةُ وَالسَّلاَمُ حَقٌّ وَالْقِصَاصُ فِيْمَا بَيْنَ الْخُصُوْمِ بِالْحَسَنَاتِ يَوْمَ الْقِيَامَةِ حَقٌّ وَاِنْ لَّمْ تَكُنْ لَهُمُ الْحَسَنَاتُ فَطَرْحُ السَّيِّئَاتِ عَلَيْهِمْ حَقٌّ جَائِزٌ .

---

(۳۶) قیامت کے دن ترازو کے ذریعے اعمال کا وزن کیا جانا حق ہے۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا حوض کوثر حق ہے۔ قیامت کے دن تنازعات کا فیصلہ کرتے وقت نیکیوں کے ذریعہ بدلہ دلایا جانا حق ہے اور اگر ان کے کھاتے میں نیکیاں نہ ہونگی تو ان پر ان کے دعویداروں کے گناہوں کا لادا جانا حق اور درست ہے۔

قیامت کے دن اعمال کو ترازو میں تول کر وزن کیا جائے گا تاہم اس کی کیفیت کیسی ہو گی اس کے بارے میں کچھ نہیں کہا جا سکتا۔ البتہ وزن اعمال کی تائید موجودہ دور کی جدید ترین ایجادات سے بخوبی ہو جاتی ہے، جیسا کے ہم آج کل بہت سی غیر مادی چیزوں کی پیائش کے قابل ہو گئے ہیں۔ مثلا درجہ حرارت کو ماپنا ہوائی قوت اور رفتار کی پیائش اور بجلی کی مختلف اکائیوں جیسے وولٹ، واٹ، امپیر، اوہم وغیرہ کی پیائش وغیرہ وغیرہ۔

آج کل کی ایجادات سے یہ بھی ہمارے مشاہدے میں آگیا ہے کہ ہماری ہر حرکت اور عمل اور ہماری ہر طرح کی آواز اپنے جملہ اتار چڑھاؤ اور تاثرات کے ساتھ ریکارڈ ہوتی ہے اور پھر جب اسے چاہیں دوبارہ دیکھ سکتے ہیں، حالانکہ ہم ان مقاصد کے لیے مادی چیزوں پر بھروسہ کرتے ہیں جبکہ ان کے مقابلے میں اللہ تعالی کا نظام ہر طرح کی خامیوں سے بالکل پاک ہے اورذرہ برابراچھا یا برا عمل اس کے ہاں ریکارڈ ہونے سے نہیں بچ سکتااور قیامت کے دن ہمارے تمام اعمال ہمارے سامنے آموجود ہوں گے ۔

قیامت کے دن نیکیوں اور برائیوں کا حساب و کتاب ہوگا اور جس کسی نے اس دنیاوی زندگی میں دوسروں پر زیادتیاں کی ہوں گی اس کی نیکیاں ان زیادتیوں کا ادھار چکانے میں خرچ ہوں گی اور اگر پھر بھی اس کے ذمے کچھ حق تلفیاں اور ناانصافیاں باقی بچ جائیں گی تو لوگوں کے گناہ اس پر لاد دیئے جائیں گے اور اس طرح اسے جہنم میں پھینک دیا جائے گا۔

اللہ تعالی ہمیں قیامت کے دن اس طرح کی صورت حال سے دوچار ہونے سے محفوظ ہونے کے لیے اس دنیا میں ظلم اور زیادتی کے ارتکاب سے بچائے۔ آمین

جنت اور جہنم

(۳۷) وَالْجَنَّةُ وَالنَّارُ مَخْلُوْقَتَانِ الْيَوْمَ لَا تَفْنِيَانِ اَبَدًا وَلَا تَمُوْتُ الْحُوْرُ الْعِيْنُ اَبَدًا وَلَا يَفْنٰى عِقَابُ اللّٰهِ تَعَالٰى وَثَوَابُهٗ سَرْمَدًا ۔

---

(۳۷) جنت اور (جہنم کی) آگ (اللہ تعالیٰ) کی دو ایسی مخلوق چیزیں ہیں جو آج بھی موجود ہیں اور کبھی فنا نہیں ہوں گی۔ موٹی آنکھوں والی حوریں کبھی بھی نہیں مریں گی۔ اللہ تعالیٰ کی سزا اور اس کا ثواب (جو وہ اپنے بندوں کو دے گا) کبھی فنا نہیں ہوں گے۔

جنت اور جہنم کو اللہ تعالیٰ نے انسانوں کو ان کے اعمال کی جزاء وسزا کے لیے تخلیق کیا ہے اور ان کے بارے میں قرآن اور احادیث نبوی میں جو تفصیلات بیان کی گئی ہیں وہ محض بطور مثال ہمارے علم اور معلومات کو مد نظر رکھتے ہوئے بیان کی گئی ہیں۔ ورنہ حقیقت میں جنت کی نعمتوں کو الفاظ کا روپ دینا ممکن ہی نہیں ہے۔ اس طرح جنت میں مومنین جن کیفیات سے سرشار ہوں گے انہیں الفاظ میں بیان ہی نہیں کیا جا سکتا، کیونکہ انہیں دنیا کی کسی بھی چیز سے تشبیہ نہیں دی جا سکتی خواہ وہ نعمت ہو یا کیفیت۔ یہی بات جہنم کے بارے میں بھی کہی جاسکتی ہے کہ اس کی ہولناکی اور اذیت کو الفاظ میں بیان کرنا ممکن نہیں ہے اور نہ ہی اس کیفیت کو الفاظ میں ڈھالا جاسکتا ہے جس سے دوزخیوں کو دو چار ہونا پڑے گا۔

جنت اور جنت کی نعمتوں کو اور دوزخ اور دوزخ کے عذاب کو کبھی بھی فنا نہیں بلکہ وہ ہمیشہ ہمیشہ کے لیے ہیں اور ابد تک رہیں گے۔

ہدایت اور گمراہی منجانب اللہ ہیں

(۳۸) وَاللّٰهُ تَعَالٰى يَهْدِيْ مَنْ يَّشَآءُ فَضْلًا مِّنْهُ وَيُضِلُّ مَنْ يَّشَآءُ عَدْلًا مِّنْهُ وَاِضْلَالُهٗ خِذْلَانُهٗ وَتَفْسِيْرُ الْخِذْلَانِ اَنْ لَّا يُوَفِّقَ الْعَبْدَ اِلٰى مَا يَرْضَاهُ عَنْهُ وَهُوَ عَدْلٌ مِّنْهُ ۔ وَكَذَا عُقُوْبَةُ الْمَخْذُوْلِ عَلَى الْمَعْصِيَةِ ۔

---

(۳۸) اللہ تعالیٰ جسے چاہتا ہے اپنے فضل وکرم سے ہدایت بخشتا ہے اور جسے چاہتا ہے عدل کی بنیاد پر گمراہ کر دیتا ہے۔ اور اللہ تعالیٰ کا کسی کو گمراہ کرنے سے مراد اسے سرگردان چھوڑ دینا ہے۔ سرگردان چھوڑ دینے کی صورت یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ اپنے بندے کو ایسے کام کرنے کی توفیق عطا نہیں کرتا جن کے ذریعے سے وہ اس سے راضی ہوتا ہو، اور ایسا کرنا اس کی طرف سے عدل کے تقاضوں کے عین مطابق ہے۔ نیز گناہ کے ارتکاب پر ایسے سرگردان شخص کو سزا دینا بھی عین انصاف ہے۔

کسی کو ہدایت دینا یا گمراہ کرنا، دونوں اللہ تعالیٰ کے اختیار میں ہیں۔ خدا کے عدل کا تقاضا تو یہ ہے کہ وہ نہ تو کسی کو ہدایت کی توفیق عطا کرے اور نہ ہی گمراہی کی طرف اسے لے جائے بلکہ اس نے جب انسانوں کو فطرت کے مطابق پیدا کر کے انہیں عقل و شعور کے زیور سے آراستہ کر دیا، نیز اچھے اور برے کی

تمیز بھی دے دی تو اب یہ خود انسانوں کا کام ہونا چاہئے وہ خود کو برائی سے بچا کر نیکی کے کاموں پر لگائے رکھیں، یہ عین عدل کے مطابق ہے۔ تاہم اللہ تعالیٰ بعض بندوں میں ان کے طبعی میلانات کی وجہ سے ان پر فضل و عنائت کرتے ہوئے انہیں ہدایت کی توفیق عطا فرماتا ہے۔ یہ اس کی طرف سے اپنے بندوں پر خصوصی عنایت ہوتی ہے جس کا دوسرے بندے عدل کی بنیاد پر اپنے لیے تقاضا نہیں کر سکتے۔

دوسری طرف جو بندے اللہ تعالیٰ کے فضل و عنایت سے محروم رہنے کی وجہ سے ہدایت کی توفیق نہ ملنے پر گمراہ ہو جاتے ہیں تو ان کی یہ گمراہی اللہ کی طرف سے عدل سے روگردانی اور ظلم کا نتیجہ نہیں بلکہ عین عدل ہے۔ اس لیے کہ ان کے اپنے طبعی میلانات ہی نے انہیں گمراہی کے راستے پر گامزن کیا ہے۔ کیونکہ اللہ تعالیٰ کسی کو گمراہی پر مائل و مجبور نہیں کرتا بلکہ یہ ہر بندے میں موجود نفس امارہ کے کرتوت ہیں جو اسے گناہ کی طرف مائل کرتا رہتاہے تاہم ایسا بھی نہیں کہ اللہ تعالیٰ نے بندوں کو صرف نفس امارہ کے ذریعے ابتلاؤ آزمائش سے دوچار کر دیا ہے بلکہ اس کی سرکشی کو نفسِ لوامہ کے ذریعہ متوازن بھی بنا دیا ہے ۔اس طرح اللہ تعالیٰ کی طرف سے عدل کے تمام تقاضے پورے ہوجاتے ہیں۔ اب یہ بندے پر منحصر ہے کہ وہ کون سا راستہ اختیار کرتا ہے۔

شیطان اور سلب ایمان

(۳۹) وَلَا يَجُوْزُ اَنْ نَّقُوْلُ اِنَّ شَيْطَانَ يَسْلُبُ الْاِيْمَانَ مِنَ الْعَبْدِ الْمُؤْمِنِ قَهْرًا وَجَبْرًا وَلٰكِن نَقُوْلُ الْعَبْدُ يَدَعُ الْاِيْمَانَ فَحِيْنَئِذٍ يَسْلُبُهُ مِنْهُ الشَّيْطَانُ .

(۳۹) یہ کہنا درست نہیں کہ شیطان بندوں اور مومن کا ایمان زبردستی چھین لیتاہے۔ بلکہ ہمارا عقیدہ یہ ہے کہ بندہ ایمان کو ترک کر دیتا ہے، تب شیطان اسے اس سے چھین لیتا ہے۔

خدا کے باغی اور نافرمانوں کا وہ گروہ جس کی قیادت ابلیس کے ہاتھوں میں ہے ؛ اس گروہ کے ہر رکن کو شیطان کہا جاتا ہے خواہ وہ جنات میں سے ہو یا انسانوں میں سے ۔اس کے علاوہ ہر انسان میں ایک شیطان چھپا ہوا ہوتا ہے جو اس کے نفس امارہ کو اکساتا رہتا ہے کہ اسے گناہ اور جرم پر مجبور کرے تاہم شیطان کے بارے میں یہ عقیدہ رکھناکہ کسی کے ایمان کو سلب کر لینا اور اپنی قدرت اور طاقت سے کسی کو گناہ میں ملوث کر دینا اس کے اختیار میں ہے، درست نہیں۔ کیونکہ دو خداؤں کا تصور کہ ایک نیکی کا خدا ہے اور دوسرا بدی کا، اسلامی عقائد کے سراسر منافی ہے۔ اسلام کا عقیدہ یہ ہے کہ ہر خیر و شر کا خالق اللہ تعالیٰ ہے ۔ لہٰذا شیطان کا کام اکسانا اور ترغیب دینا ہے، اور جب کوئی شخص اس کے اکسانے میں آکر ایمان کو خود بخود ترک کر دیتا ہے تو شیطان موقع غنیمت جان کر اسے ایمان سے

زیادہ سے زیادہ دور لے جانے کی کوشش شروع کر دیتا اور اسے ہر وقت ورغلاتا رہتا ہے تاکہ اس کا نفس لوامہ (ضمیر) اسے ایمان و ہدایت کی طرف مائل نہ کرے۔

منکر نکیر اور عذاب قبر

(٤٠) وَسُؤَالُ مُنْكَرٍ وَّ نَكِيْرٍ حَقٌّ كَائِنٌ فِي الْقَبْرِ وَإِعَادَةُ الرُّوْحِ اِلَى الْجَسَدِ فِيْ قَبْرِهٖ حَقٌّ وَضَغْطَةُ الْقَبْرِ وَعَذَابُهٗ حَقٌّ كَائِنٌ لِلْكُفَّارِ كُلِّهِمْ وَلِبَعْضِ عُصَاةِ الْمُؤْمِنِيْنَ حَقٌّ جَائِزٌ.

(۴۰) منکر اور نکیر کا قبر میں (مردے سے) سوال کرنا حق ہے اور ایسا ہوتا ہے۔ قبر میں روح کا مردے میں لوٹایا جانا حق ہے۔ قبر کا مردے کو دبانا اور قبر کا عذاب تمام کفار اور بعض نافرمان مؤمنین کے لیے حق ہے اور ایسا ہوتا ہے۔

مرنے کے بعد سے لیکر قیامت کے دن دوبارہ زندہ ہونے تک کا عرصہ عالم برزخ کہلاتا ہے، جو گویا اس دنیاوی زندگی اور آخرت کی زندگی کے درمیان ایک عارضی دور ہے۔اس عارضی دور میں انسان کی روح اس کے جسم سے الگ رہتی ہے ۔ اس دوران اللہ کے مقرب اور نیک بندوں کی روحیں مقام علیّین میں رہتی ہیں۔ جبکہ کفار و مشرکین اور برے لوگوں کی روحیں مقام سجّین میں قید رہتی ہیں۔ اس جدائی کے باوجود روح کا اپنے جسم سے ایک طرح کا تعلق اور ناتا برقرار رہتا ہے، خواہ جسم صحیح سالم حالت میں قبر میں موجود ہو، اسے جانور چیر پھاڑ کر کھا گئے ہوں یا اسے جلا کر راکھ کر دیا گیا ہو۔ کیونکہ سائنس نے ثابت کر دیا ہے کہ مادہ کو فنا نہیں ہے۔ اس کی حالت تبدیل ہو سکتی ہے، وہ مختلف اجزاء میں بکھر سکتاہے اور نئے نئے مرکبات میں ڈھل سکتاہے حتی کہ عناصر ایٹوں میں تبدیل ہو جاتے ہیں اس کے باوجود مادہ ختم نہیں ہوتا۔ دوسری طرف عالم میں

برزخ میں منکر اور نکیر کا مردے سے سوالات کرنا، روح کا مردے میں لوٹایا جانا اور مردے کا عذاب سے دوچار ہونا قرآن و احادیث صحیحہ سے ثابت ہے۔

قرآن مجید میں عالم برزخ کے عذاب کے سلسلے میں دو آیتیں واضح طور پر اس کی شاہد ہیں:

(۱) سورۃ غافر (مومن) میں موسیٰ کا فرعون اور آل فرعون سے مقابلے کا ذکر کرتے ہوئے اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں: پس اللہ تعالیٰ نے اسے (موسیٰ کو) ان کے مکر وفریب کے شر سے بچالیا اور آل فرعون کو برے عذاب نے گھیر لیا۔ وہ صبح شام آگ پر پیش کیے جاتے ہیں اور جب قیامت کا دن ہوگا (تو کہا جائے گا) آل فرعون کو شدید ترین عذاب میں داخل کر دو۔ (۴۶، ۴۵،۴۰)اس آیت کریمہ کے مطابق قیامت کے دن سے پہلے آل فرعون صبح و شام جہنم کی آگ کے پاس لا کر انہیں بتایا جاتا ہے کہ یہ ہے تمھارا اصلی ٹھکانا اور یہ چیز ایک بڑے عذاب کی صورت میں ہر وقت انھیں شدید اذیت سے دوچار رکھے گی اور کسی پل انہیں چین نصیب نہیں ہو گا۔ یہ ہے عالم برزخ کا عذاب جسے احادیث میں جہنم کی کھڑکی کھول دینے سے تعبیر کیا گیا ہے۔

(۲) دوسری آیت سورۃ نوح کی ہے جس میں قوم نوح کے بارے میں ارشاد باری تعالیٰ ہے: ان کے گناہوں کے سبب انہیں ڈبو دیا گیا، پھر انہیں آگ میں جھونک دیا گیا ہے: (۲۵،۷۱) اس آیت کریمہ میں انھیں ڈبونے اور آگ میں جھونک دینے کے دونوں صیغے ماضی کے ہیں، یعنی غرقاب کرنے کے ساتھ ہی انہیں آگ میں ڈال دیا گیا۔

اگر عالم برزخ میں مردوں کو عذاب نہ ہوتا تو غرق کرنے کا صیغہ ماضی کا اور آگ میں ڈالنے کا صیغہ لازماً مضارع یعنی مستقبل کا لایا جاتا۔ ان دو آیات کے علاوہ متعدد صحیح احادیث میں عالم برزخ کے احوال کا ذکر موجود ہے۔

صفات باری تعالیٰ اور غیر عربی الفاظ

(٤١) وَكُلُّ شَيْءٍ ذَكَرَهُ الْعُلَمَاءُ بِالْفَارِسِيَّةِ مِنْ صِفَاتِ اللّٰهِ تَعَالٰى عَزَّ اسْمُهُ فَجَائِزٌ الْقَوْلُ بِهِ سِوَى الْيَدِ بِالْفَارِسِيَّةِ وَيَجُوْزُ اَنْ يُّقَالَ بَرُوْیِ خُدَایِ عَزَّ وَجَلَّ بِلَا تَشْبِيْهٍ وَلَا كَيْفِيَّةٍ .

(۴۱) اللہ تعالیٰ کی وہ تمام صفات جن کا ذکر علماء نے فارسی زبان میں کیا ہے ان صفات کا اپنی گفتگو میں استعمال کرنا جائز ہے ، ماسوائے فارسی میں ہاتھ کے لیے مستعمل لفظ کے ۔لہٰذا "خدائے عزوجل کے روئے مبارک کی قسم" جیسے الفاظ استعمال کرنا جائز ہے۔ لیکن اس طرح کے الفاظ بغیر کسی تشبیہ اور کیفیت کے استعمال کرنے چاہئیں۔

اللہ تعالیٰ کے بعض ذاتی اور فعلی صفات ایسی ہیں جن کی حقیقت کے بارے میں کچھ کہنا مشکل ہے۔ اس لیے ہم ان کے اسی مفہوم پر ایمان رکھتے ہیں جو ان صفات کے لیے عربی میں مستعمل الفاظ سے فوری طور پر ذہن میں آتا ہے۔ مثلاً اللہ تعالیٰ کے لیے ہاتھ، چہرہ اور نفس وغیرہ جیسے الفاظ کا استعمال ۔ تاہم جیسا کے پہلے بیان ہو چکا ہے، ہم ان الفاظ سے ہو بہو وہی چیزیں مراد نہیں لے سکتے جو انسانوں کے لیے مخصوص ہیں ۔ یعنی اللہ تعالیٰ کے لیے لفظ: وجہ: یعنی چہرہ کا استعمال ان معنوں میں ہرگز نہیں ہے کہ العیاذ باللہ انسانوں کے چہرہ کی طرح اللہ

کا چہرہ ہے، کیونکہ اللہ تشبیہ سے پاک اور ماوراء ہے۔ تاہم اللہ کا چہرہ ہے ضرور، جس کی حقیقت سے ہم آگاہ نہیں ہیں۔

عربی زبان کے سوادیگرزبانوں میں اللہ تعالیٰ کی صفات کے لیے مستقل عربی الفاظ کا ترجمہ البتہ نہایت ہی احتیاط کا متقاضی ہے۔ کیونکہ بعض اوقات ایک زبان میں مستعمل لفظ کا مفہوم و معنی اسی چیز کے لیے کسی دوسری زبان میں مستعمل لفظ کے مفہوم و معنی سے متغایر ہو سکتا ہے۔ اس لیے کہ ہر زبان میں مستعمل بعض الفاظ کے پیچھے پورا ایک تاریخی پس منظر ہوتا ہے جس سے ان الفاظ کو جدا نہیں کیا جا سکتا۔ مثلاً کلمہ "خیرباد" کہنا کسی کو الوداع کہنا اور کسی چیز کو ترک کرنے کے معنی میں بولا جاتا ہے، اور دیکھنے میں آیا ہے کہ اسے بری عادتوں کو ترک کرنے کے سلسلے میں بھی استعمال کیا جاتا ہے۔ جیسے "اس نے چوری کی عادت کو خیر باد کہا" وغیرہ۔ حالانکہ "خیر باد" کا لفظی معنی ہے "خیریت سے رہو" یا "خیریت ہو"۔ گویا یہ ایک دعائیہ کلمہ ہے اور ظاہر ہے کہ چوری کی عادت کے لئے یہ دعا کرنا کہ "تم خیریت سے رہو" چنداں مناسب نہیں ہے۔

اسی بنا پر فارسی زبان میں ہاتھ کے لیے دست کا جو لفظ مستعمل ہے اسے اس کے مقابل عربی لفظ ید کے لیے اس وقت استعمال کرنا جب اس سے ید اللہ یعنی اللہ کا ہاتھ مراد ہو، درست نہیں ہو گا۔ البتہ دوسری صفات کے لیے مستعمل فارسی الفاظ استعمال کیے جا سکتے ہیں۔ اس طرح فارسی کے علاوہ غیر زبانوں کو اس کے مقابل عربی الفاظ کی جگہ استعمال کرنے سے پہلے ضروری چھان بین کر لینی چاہیے۔

قرب اور بعد خداوندی

(٤٢) وَلَيْسَ قُرْبُ اللّٰهِ تَعَالٰى وَلَا بُعْدُهُ مِنْ طَرِيْقِ طُوْلِ الْمَسَافَةِ وَقِصَرِهَا وَلٰكِنْ عَلٰى مَعْنَى الْكَرَامَةِ وَالْهَوَانِ . وَالْمُطِيْعُ قَرِيْبٌ مِنْهُ بِلَا كَيْفٍ وَالْقُرْبُ وَالْبُعْدُ وَالْإِقْبَالُ يَقَعُ عَلَى الْمُنَاجِيْ وَكَذٰلِكَ جِوَارُهُ فِي الْجَنَّةِ وَالْوُقُوْفُ بَيْنَ يَدَيْهِ بِلَا كَيْفِيَّةٍ .

---

(۴۲) اللہ تعالیٰ کی قربت اور بعد سے فاصلوں کی دوری یا نزدیکی مراد نہیں ہے بلکہ اس سے مراد اعزاز واکرام اور ذلت و خواری ہے۔ لہذا اطاعت گزار اللہ تعالیٰ کے قریب ہوتا ہے مگر اس قربت کی کیفیت معلوم نہیں۔ اور گناہ گار اللہ تعالیٰ سے دور ہوتا ہے مگر اس کی کیفیت معلوم نہیں۔ قربت یا دوری یا پیش قدمی کرنے جیسے امور کا اعتبار اللہ تعالیٰ کے حضور مناجات کرنے والے بندے کے اعتبار سے ہوتا ہے۔ اسی طرح جنت میں اس کا اللہ تعالیٰ کے جوار میں ہونا یا اس کے حضور کھڑے ہونے سے بھی یہی مراد ہے، البتہ ہم ان کیفیات کو نہیں جانتے۔

اللہ تعالیٰ کی نسبت کی بنا پر فاصلوں اور جہتوں یا سمتوں کا معاملہ بظاہر الجھن کا باعث نظر آتا ہے۔ کیونکہ فاصلوں اور جہات کا تعلق اجسام سے ہوتا ہے جو محدود

ہوتے ہیں۔

خواہ وہ کتنے ہی بڑے، لمبے اور چوڑے اجسام ہی کیوں نہ ہوں۔ کیونکہ کہیں نہ کہیں وہ جاکر ختم ہو جاتے ہیں اور وہی ان کی آخری حد ہوتی ہے اور اس طرح شش جہات سے ان کے حدود متعین ہو جاتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ چونکہ جسم اور جسم کی خامیوں سے پاک ہونے کے ساتھ ساتھ لامحدود بھی ہیں لہٰذا اس کی نسبت سے قرآن مجید اور احادیث میں اس سے قریب ہونے یا دور ہونے یا اس کے آسمان دنیا پر نزول اجلال فرمانے جیسے بیانات الجھاؤ کا باعث بنتے ہیں۔ لیکن اگر چند ضروری باتیں ذہن نشین کرلی جائیں تو اس الجھن کا دور ہونا کچھ مشکل نہیں:

ا۔ اللہ تعالیٰ زمین و آسمان کا نور ہے۔ نور اور روشنی اور طاقت کے مجموعے کو کہتے ہیں۔ گویا اللہ تعالیٰ کی روشنی اور طاقت نے ہر شے کا احاطہ کیا ہوا ہے اور اس لامحدود کائنات کا کوئی گوشہ ایسا نہیں ہے جہاں اللہ کا نور موجود نہ ہو۔ یعنی اللہ کا نور ہر جگہ، ہر طرف، ہر سمت جلوہ ریز ہے البتہ کہیں مستور و نہاں ہے اور کہیں ظاہر و عیاں ہے۔

۲۔ اللہ کی رحمت اور فضل و عنایت کی مثال اس ابر باراں کی طرح ہے جو کہیں کھل کر برستی ہے اور موسلا دھار بارش سے ہر طرف جل تھل ہو جاتا ہے اور کہیں بوندا باندی ہوتی ہے اور محض پھوار سے ہوا کی گرد بیٹھ جاتی ہے اور اس میں خنکی پیدا ہو جاتی ہے۔

۳۔ اللہ کی قربت اور دوری کے حوالے سے فاصلوں اور جہات کا تعلق خود اللہ تعالیٰ کی ذات سے نہیں ہے بلکہ اس کا تعلق بندوں کے حوالے سے ہے۔ یعنی اللہ تعالیٰ کا نور تو ہر طرف موجود ہے اور اس کی رحمت ہر سو پھیلی ہوئی ہے تاہم مقرب بندوں پر اس کا نور ان کے حسب مراتب جلوہ ریز ہوتا رہتا ہے اور اس کی رحمت کا فیضان موسلادھار بارش کی صورت اختیار کر جاتا ہے جسے ہم اس کی قربت

سے تعبیر کرتے ہیں جبکہ گناہوں کے حجابات اللہ کے نور کو گناہ گاروں سے مستور کر دیتے ہیں اور اس کی رحمت کے فیضان کو پھوار کی حد تک کم کر دیتے ہیں اور اسے ہم اس سے دوری سے تعبیر کرتے ہیں۔

و اللہ اعلم بالصواب

....

قرآن مجید کی آیات فضیلت میں برابر ہیں

(۴۳) وَالْقُرْآنُ مَنزَّلٌ عَلَىٰ رَسُوْلِ اللّٰهِ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ وَهُوَ فِيْ الْمَصَاحِفِ مَكْتُوْبٌ وَآيَاتُ الْقُرْآنِ فِيْ مَعْنَى الْكَلَامِ كُلُّهَا مُسْتَوِيَةٌ فِي الْفَضِيْلَةِ وَالْعَظَمَةِ . اِلَّا اَنَّ لِبَعْضِهَا فَضِيْلَةَ الذِّكْرِ وَفَضِيْلَةَ الْمَذْكُوْرِ مِثْلُ آيَةِ الْكُرْسِيِّ لِاَنَّ الْمَذْكُوْرَ فِيْهَا جَلَالُ اللّٰهِ تَعَالٰى وَعَظَمَتُهٗ وَصِفَاتُهٗ فَاجْتَمَعَتْ فِيْهَا فَضِيْلَتَانِ فَضِيْلَةُ الذِّكْرِ وَفَضِيْلَةُ الْمَذْكُوْرِ . وَلِبَعْضِهَا فَضِيْلَةُ الذِّكْرِ فَحَسْبُ مِثْلُ قِصَّةِ الْكُفَّارِ وَلَيْسَ لِلْمَذْكُوْرِ فِيْهَا فَضْلٌ وَهُمُ الْكُفَّارُ . وَكَذٰلِكَ الْاَسْمَاءُ وَالصِّفَاتُ كُلُّهَا مُسْتَوِيَةٌ فِي الْعَظَمَةِ وَالْفَضْلِ لَا تَفَاوُتَ بَيْنَهَا .

....

(۴۳) قرآن مجید سول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پر نازل ہوا اور مصاحف میں لکھا ہوا موجود ہے۔ قرآن مجید کی تمام آیات کلام اللہ ہونے کی بناء پر فضیلت و عظمت کے اعتبار سے برابر ہیں۔ البتہ بعض آیات میں کلام اور مذکور کلام ہر دو عظمت و برتری والے ہوتے ہیں جیسے آیت الکرسی میں جو کچھ مذکور ہے وہ اللہ تعالیٰ کی عظمت و جلال اور صفت مقدسہ ہیں لہٰذا آیت الکرسی کے لیے خود کلام اللہ ہونے کی فضیلت کے ساتھ

ساتھ مندرجات و مضمون کلام کی فضیلت بھی یکجا ہوگئی ہے۔ جبکہ بعض آیات کی فضیلت و عظمت کے لیے ان کا کلام اللہ ہونا ہی کافی ہے۔ جیسے وہ آیات جن میں کفار کا بیان ہے۔ کیونکہ ان آیات میں جن کا ذکر ہورہا ہے وہ کفار ہیں جنہیں کچھ بھی فضیلت حاصل نہیں ہے۔ اسی طرح اللہ تعالیٰ کے تمام نام اور اس کی تمام صفات فضیلت و عظمت میں برابر ہیں اور ان میں کوئی فرق نہیں ہے۔

....

کسی بھی کلام یا تحریر کے مقام و مرتبہ کو متعین کرنے میں دو باتیں نہایت ہی اہم ہوتی ہیں : اول وہ کلام یا تحریر کس شخصیت کی ہے ۔اور دوم اس میں جو کچھ بیان کیا گیا ہے اس کا موضوع کیا ہے ؟ صاحب کلام یا تحریر کی ہستی جس قدر جلیل القدر ہوگی کلام یا تحریر کی حیثیت اسی قدر بلند و برتر ہوگی ۔ اور اس کلام اور تحریر کے وہ حصے خصوصیت کے ساتھ اہمیت اور قدر و قیمت کے حامل ہونگے جن میں کسی عظیم سوچ اور فکر کو اجاگر کیا گیا ہو، کوئی اچھوتا خیال پیش کیا گیا ہو یا رہنمائی و ہدایت کے لیے رہنما اصول فراہم کیے گئے ہوں۔

قرآن مجید اللہ تعالیٰ کا کلام ہے ۔ اور اللہ تعالیٰ کی شخصیت اور ہستی کی عظمت و جلالت مرتبت کسی دلیل کی محتاج نہیں ہے ۔ لہٰذا قرآن مجید سارا کا سارا بلند پایہ اور جلیل الشان کلام ہے ۔ تاہم قرآن مجید کے وہ حصے دوہری فضیلت کے حامل ہیں جن میں لوگوں کو رشدو ہدایت کی موضوع سخن بنایا گیا ہے، ان کے فکر و خیال کو مہمیز کرنے کا مواد موجود ہے ، یا رب ذوالجلال کی عظمت کو بیان کیا ۔

....

اولاد رسول ﷺ

(٤٤) وَقَاسِمُ وَطَاهِرٌ وَابْرَاهِيْمُ كَانُوْ بَنِيَّ رَسُوْلِ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ وَفَاطِمَةُ وَرُقَيَّةُ وَزَيْنَبُ وَاُمُّ كُلْثُوْمٍ كُنَّ جَمِيْعًا بَنَاتِ رَسُوْلِ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ .

(۴۴) قاسم ، طاہر اور ابراہیم نبی کریمؐ کے بیٹے اور فاطمہ ، رقیہ ، زینب اور ام کلثوم سب کی سب آپؐ کی بیٹیاں تھیں ۔

بعض افراد اور فرقوں پر تعصب کا اس قدر غلبہ ہوتا ہے کہ وہ تاریخی حقائق اور ٹھوس سچائیوں تک کاانکار کر دیتے ہیں ۔ عقل کے یہ اندھے صداقت کی چکا چوند روشنی سے بچنے کے لیے ضلالت و گمراہی کی تاریکیوں میں چھپنے ہی میں عافیت سمجھتے ہیں اور سدا انھی تاریکیوں میں بھٹکتے رہتے ہیں۔

نبی کریمؐ کو اللہ تعالیٰ نے بیٹوں اور بیٹیوں سے نوازا تھا اور آپؐ کے تین بیٹے اور چار بیٹیاں تھیں ۔ سوائے ابراہیم کے باقی ساری اولاد ام المؤ منین خدیجۃ الکبریٰؓ سے ہوئی۔ نبی کریمؐ نے اپنے بیٹے قاسم کی نسبت سے ابو القاسم کنیت اختیار فرمائی تھی ۔ آپؐ کے بیٹے طاہر کا دوسرا نام عبداللہ تھا۔ آپؐ کے تینوں بیٹے کم عمری ہی میں اللہ کو پیارے ہو گئے تھے۔ البتہ آپؐ کی چاروں بیٹیاں بڑی عمر کو پہنچیں اور ان کی شادیاں ہوئیں اور اللہ تعالیٰ نے انھیں اولاد سے نوازا ۔

آپؐ کی دو بیٹیاں حضرت رقیہؓ اور حضرت ام کلثومؓ یکے بعد دیگرے حضرت عثمان بن عفانؓ کے نکاح میں آئیں اور انھیں ذوالنورین کا لازوال شرف عطا

کر گئیں ۔ آپؐ کی بیٹی حضرت فاطمہ الزہراؓ کی شادی آپؐ کے چچا زاد بھائی علی بن ابی طالبؓ سے ہوئی ۔ نبی کریمؐ ان دونوں سے بے انتہا محبت کرتے تھے ۔ کیونکہ علی کی پرورش خود نبی کریمؐ نے کی تھی اور آپؐ ان پر بہت اعتماد کرتے تھے ۔
رسول اکرم ﷺ کو اپنے دونوں نواسوں حضرت حسنؓ اور حضرت حسینؓ سے بہت پیار تھا جو صورت و سیرت میں ہو بہو اپنے ناناؐ پر گئے تھے ۔

عقائد اور ان کی پہچان

(٤٥) وَاِذَاْ اُشْكِلَ عَلَى الْاِنْسَانِ شَيْءٌ مِّنْ دَقَاْئِقِ عِلْمِ التَّوْحِيْدِ فَاِنَّهُ يَنْبَغِيْ لَهُ اَنْ يَّعْتَقِدَ فِي الْحَالِ مَا هُوَ الصَّوَاْبُ عِنْدَ اللّٰهِ تَعَالٰى اِلٰى اَنْ يَّجِدَ عَالِمًا فَيَسْاَلُهُ . وَلَا يَسَعُهُ تَاْخِيْرُ الطَّلَبِ وَلَاْ يُعْذَرُ بِالْوَقْفِ فِيْهِ وَيَكْفُرُ اِنْ وَقَفَ .

---

(۴۵) اگر کسی انسان پر توحید کے علم کی باریکیوں میں سے کسی بات کا سمجھنا دشوار ہو تو اسے چاہیے کہ فوری طور پر وہ اس کی صحیح اور درست تفصیلات خدا کے سپرد کرتے ہوئے اجمالی طور پر ایمان لے آئے تاوقتیکہ اسے کوئی عالم مل جائے جس سے وہ درست معلومات وتفصیلات جان لے۔ لیکن اس سلسلے میں کسی قسم کی تاخیر کرنے کی گنجائش نہیں اور نہ ہی توقف کرنے پر قابل درگزر سمجھا جائے گا، بلکہ اگر وہ توقف کرے گا تو کافر ہو جائے گا۔

اب تک کی تفصیلات سے عقیدہ کی اہمیت کا اندازہ ہو گیا ہوگا۔

سچ تو یہ ہے کہ اعمال کے سلسلے میں کوتاہی کو نظر انداز کیا جاسکتا ہے اور اس سے درگزر ہو سکتا ہے لیکن عقیدہ کے سلسلے میں کسی بھی قسم کی کوتاہی اور غفلت ناقابل معافی ہے۔ اس لیے کہ تمام اعمال کا دارومدار ہی عقیدہ پر ہے اور عقیدہ اعمال کے

لیے بنیاد کی حیثیت رکھتا ہے۔ لہٰذا اگر عقیدہ درست نہ ہو تو اعمال کی پوری عمارت ناقابل اعتبار قرار پائے گی۔ بقول شاعر:

خشت اول چوں نہد معمار کج
تا ثریا می رود دیوار کج

یعنی اگر معمار عمارت کی اینٹ ٹیڑھی رکھ دے تو آسمان تک دیوار ٹیڑھی ہی اٹھتی چلی جائے گی۔

قرآن مجید میں جتنا زور عقیدہ کی درستی پر دیا گیا ہے شاید ہی کسی اور بات پر دیا گیا ہو۔ قرآن کریم کا ایک تہائی حصہ تو محض عقیدہ توحید سے متعلق ہے۔ جیسا کہ ایک حدیث میں سورۂ اخلاص کو قرآن کریم کے ایک تہائی کے برابر قرار دیا گیا ہے جس کا مطلب یہ ہے کہ قرآن مجید کے ایک تہائی میں جو کچھ بیان کیا گیا ہے اس کا خلاصہ سورے اخلاص میں سمو دیا گیا ہے۔ قرآن کریم میں توحید کے علاوہ رسالت، آخرت، قیامت، جنت اور جہنم کے حوالے سے سینکڑوں آیات مبارکہ موجود ہیں۔ اس کے برعکس اعمال سے متعلق آیات الاحکام کی تعداد بمشکل پانچ سو کے لگ بھگ ہے۔

لہٰذا یہ ہر مومن کا فرض ہے کہ وہ اپنی اولین فرصت میں اپنے عقیدہ کو درست کرنے اور اس کے بارے میں ضروری معلومات حاصل کرنے کی کوشش کرے اور جب تک کسی صاحب علم سے درست معلومات حاصل نہیں کرتا ان پر اجمالی طور پر ایمان رکھے تاہم اس سلسلے میں بے جا تاخیر اور لاپرواہی کے مرتکب ہونے سے خود کو بچایئے۔

واقعہ معراج

(٤٦) وَخَبَرُ الْمِعْرَاجِ حَقٌّ وَمَنْ رَدَّهُ فَهُوَ مُبْتَدِعٌ ضَالٌّ.

(٤٦) معراج کی روایت درست اور حق ہے۔ اس کا منکر بدعتی اور گمراہ ہو گا۔

واقعہ معراج کے دو حصے ہیں: حصہ اول کا تعلق مکہ مکرمہ میں المسجد الحرام سے بیت المقدس میں المسجد الاقصیٰ تک کے سفر سے ہے جس کا ذکر خود قرآن مجید میں سورۃ الاسراء کی ابتدائی آیت کریمہ میں کیا گیا ہے۔ رات کے اس سفر کا انکار کفر ہے، کیونکہ اس کا ذکر خود اللہ تعالیٰ نے اپنے کلام میں کیا ہے اور کلام اللہ کے کسی بھی حصے کی تکذیب اور اسے جھٹلانا کفر ہے۔

دوسرا حصہ بیت المقدس میں مسجد اقصیٰ سے آسمانوں تک اور وہاں سے سدرۃ المنتہیٰ تک کے سفر کا ہے جس کا ذکر صحیح اور صریح احادیث میں پوری تفصیلات کے ساتھ آیا ہے۔ اس کے انکار کی صورت میں اگرچہ کسی کو کافر نہیں ٹھہرایا جا سکتا تاہم یہ ایمان کی کمزوری کی دلیل ہو گی اور ایمان کی کمزوری آدمی کو بدعات اور گمراہی میں مبتلا کرنے کا باعث ہوتی ہے، لہٰذا اس سے خود کو بچانا چاہیئے۔ ضروری نہیں کہ ہر بات جو ہماری عقل میں نہ آسکے وہ غلط اور جھوٹی ہو۔ کیونکہ عقل کا دائرہ کار نہایت محدود ہے۔ وہ محض مادی اشیاء اور طبعی امور کا ادراک کر سکتی ہے۔ غیر مادی اور ماورائے طبعیات اشیاء کا ادراک اس کے بس کی بات نہیں ہے۔ کیونکہ عقل اپنی معلومات کے لیے حواس خمسہ پر بھروسہ کرتی ہے اور انہی سے حاصل شدہ معلومات کا تجربہ کر کے نتائج اخذ کرتی ہے اور ہم سب جانتے ہیں کہ ہمارے حواس خمسہ کا دائرہ کار نہایت ہی محدود ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے

ہماری رہنمائی کے لیے اور عقل کی مدد کے لیے وحی و الہام کا طریقہ منتخب افراد کے ذریعے ہماری رشدوہدایت کا انتظام کیا ہے۔

یہ واقعہ معراج ہی ہے جس کی تصدیق پر حضرت ابو بکر کو الصدیق کا شہرہ آفاق خطاب ملا جو خود اللہ تعالیٰ کی طرف سے حضرت جبرائیل علیہ السلام کی زبان سے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو بتایا گیا تھا۔

علامہ اقبال اس واقعہ کے بارے میں کہتے ہیں:

سبق ملا ہے یہ معراج مصطفیٰ سے مجھے
کہ عالم بشریت کی زد میں ہے گردوں

نبی آخر الزماں صلی اللہ علیہ وسلم کے ایسے معجزات مثلاً شق الصدر، شق القمر اور معراج وغیرہ دراصل انفس وآفاق کی تسخیر کی عملی پیش گوئیاں تھیں جنہیں جدید سائنس ایک ایک کر کے سچ ثابت کرتی جارہی ہے۔

علامات قیامت

(٤٧) وَخُرُوْجُ الدَّجَّالِ وَيَأْجُوْجَ وَمَأْجُوْجَ وَطُلُوْعُ الشَّمْسِ مِنْ مَغْرِبِهَا وَنَزُوْلُ عِيْسٰى عَلَيْهِ السَّلَامُ مِنَ السَّمَاءِ وَسَائِرُ عَلَامَاتِ يَوْمِ الْقِيَامَةِ عَلٰى مَا وَرَدَتْ بِهِ الْاَخْبَارُ الصَّحِيْحَةُ حَقٌّ كَائِنٌ وَاللّٰهُ تَعَالٰى يَهْدِي مَنْ يَّشَاءُ اِلٰى صِرَاطٍ مُّسْتَقِيْمٍ.

(۴۷) دجال کی آمد، یاجوج ماجوج کا خروج، سورج کا مغرب سے طلوع ہونا، عیسیٰ علیہ السلام کا آسمان سے نازل ہونا اور دیگر تمام علاماتِ قیامت جن کا ذکر صحیح احادیث اور مستند روایات میں آیا ہے سب کے سب سچ اور حق ہیں اور ہو کر رہیں گے۔

اللہ تعالیٰ جس کو چاہتا ہے سیدھے راستے پر چلنے کے لیے ہدایت عطا فرماتا ہے۔

نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے جب قیامت کے بارے میں پوچھا گیا کہ کب آئے گی، تو آپ ؐ نے لا علمی کا اظہار کیا تھا۔ تاہم علامات قیامت کے سلسلے میں کچھ عمومی اور کچھ مخصوص قسم کے واقعات و حادثات کے بارے میں آپ ؐ نے اپنی امت کو ضرور باخبر کیا ہے۔ ان واقعات و علامات کے سلسلہ میں کتب حدیث میں صحیح احادیث موجود ہیں جن میں سے بعض کی حیثیت قرآن کریم میں مذکور

آیات کی تفسیر و تشریح کی ہے اور بعض میں آپؐ نے وحی غیر متلو کی بنیاد پر اپنے صحابہ کرام کو کسی واقعہ یا حادثہ سے آگاہ فرمایا جو قیامت کے قرب کی نشانی ہوگی۔
ان تمام پر ہمارا ایمان ہونا چاہیے۔

﴿ وما علینا الا البلاغ ﴾